باب14

کشمیریات

حصہ اوّل

معلومات

ڈوگرہ راج کے خاتمہ کے بعد ریاست

مسئلہ کشمیر کی وجہ سے آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے علاقے آزاد اور پاکستان کے زیر انتظام ہونے کے باوجود ہندوستانی زیر انتظام کشمیر کی غلامی کی وجہ سے پاکستانی شہریت کے مساوی حقوق سے محروم ہیں جو پاکستان کے دوسرے علاقوں اور لوگوں کو حاصل ہیں۔ کشمیر کے دونوں حصوں کے آئین اور سیاسی نظام سے واقفیت کی بنا پر میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ ان کا مختصر تذکرہ کر کے تقابلی جائزہ بھی نظر قارئین کروں۔

ریاست جموں وکشمیر ریاست کے طور پر بیع نامہ امرتسر 1846 کی وجہ سے وجود میں آئی، وگرنہ اس کے حصے مختلف یونٹس میں الگ الگ راجوں کے زیر تسلط علاقے تھے جن کو انگریز اور ڈوگرہ مہاراجہ کی تلوار کے سائے میں اکٹھا کیا گیا۔ معاہدہ امرتسر کے تحت دریائے راوی اور دریائے سندھ

کے درمیانی علاقے شامل تھے لیکن بعدازاں ہزارہ اور پوٹھوہار کے مسلم اکثریتی علاقوں کے بدلے مہاراجہ کشمیر نے بھمبر، نوشہرہ اور اس کے درمیانی ہندو اکثریتی علاقے لے لیے۔ دنیا میں ملک فتوحات، سازش یا ادغام سے ہی وجود میں آتے ہیں۔ مہاراجہ کشمیر نے بھی یہی طریقہ اپنایا۔

کشمیر اصل میں صرف وادی کشمیر ہی ہے جس پر معلوم تاریخ کے مطابق غیر ملکی یا غیر کشمیری ہی کشمیریوں کی ملی بھگت سے حکومت کرتے رہے۔ اس کی سرحدیں وقت کے حکمرانوں کی طاقت اور کمزوری کے ساتھ بڑھتی گھٹتی رہیں۔ کبھی کابل سے ملتان تک اور کبھی سمٹ کر محض وادی تک رہتی رہیں لیکن اس ریاست نے ایک مربوط قانونی ریاست کی حیثیت 1846 میں ہی اختیار کی۔

14 اگست 1947 کو اس کا کُل رقبہ 84471 مربع میل تھا جو دنیا کے 111 ممالک سے بڑا تھا۔ یہ ریاست اس وقت تین ملکوں کے قبضہ میں ہے جس میں سے ہندوستان کے پاس اس کا 48 فیصد، پاکستان کے پاس 35 فیصد اور چین کے پاس 17 فیصد، جس میں سیاہ چن اور قراقرم کے علاقے شامل ہیں۔ ریاست میں کشمیری، ڈوگری، پہاڑی، گوجری، پنجابی، اردو، پشتو، بلتی، لداخی، شینا، کوہستانی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس کی غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ہندو زیادہ تر صوبہ جموں میں رہتے تھے اور لداخ میں بدھ مت کے ماننے والے ہیں لیکن ان علاقوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ 1941 کی مردم شماری کے مطابق ریاست کی کُل آبادی 4021616 نفوس پر مشتمل تھی۔ ریاست اندرونی طور پر تقریباً مکمل خود مختار تھی کیوں کہ یہ برطانوی ہندوستانی صوبوں میں شامل نہیں تھی لیکن برطانوی حاکمیت اعلیٰ کا اس پر بھی اطلاق ہوتا تھا۔ ریاست کے کچھ اندرونی معاملات برٹش ریزیڈنٹ کی منظوری کے بغیر حکومت طے نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح خارجہ ممالک کے ساتھ اس کے سارے معاملات برٹش انڈیا گورنمنٹ کے اختیار میں تھے۔ مہاراجہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ ''معاہدہ جُوں کا توں'' (Stand Still) پر اس کی روح کے مطابق دیانت داری سے عمل کیا جاتا تو پاکستان کو خود بخود وہ سارے اختیارات حاصل ہو جاتے جو برطانوی ہند کو کشمیر پر حاصل تھے۔ دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات کے لیے اس ریاست میں رہنے والوں کی شہریت بھی ہندوستانی تھی لیکن علاقائی شناخت کے

طور پر ریاستی باشندے کہلائے جاتے تھے۔ مہاراجہ وقت نے پنجاب کی سکھ حکومت اور برٹش انڈیا کا اثر ورسوخ بڑھنے کی وجہ سے کشمیری پنڈتوں اور جموں کے ہندو راج پوتوں کے مطالبے پر مقامی آبادی کے حقوق کو تحفظ دینے کے لیے 20 اپریل 1927 میں ریاستی باشندہ کے قواعد کا اجرا کیا جس کے تحت مقامی آبادی کی درجہ بندی کی گئی۔ ریاستی باشندہ درجہ اوّل، درجہ دوم اور درجہ سوم مقرر کیے گئے جن کو باہم ایک دوسرے پر اندرونی حقوق کے حصول کے لیے ترجیح حاصل تھی۔ جبکہ اس درجہ بندی کے لوگوں کو باہر کے سب لوگوں پر فوقیت حاصل تھی اور ہے بھی۔ اس قانون کی وجہ سے پنجاب کے سکھ حکمران جس کے زیر تسلط اس وقت یہ ریاست تھی، کے باشندوں پر روک لگائی گئی لیکن خصوصی معاملات میں وقت کے حکمران کو یہ اختیار حاصل تھا کہ غیر ریاستی باشندوں کو بھی کسی ملازمت کے لیے وہ حقوق دیئے جائیں جس کی اہلیت کا فرد ریاستی باشندوں میں نہ پایا جائے۔ اس قانون کے تحت ریاستی سرکار میں نوکریوں، وظیفوں، سرکاری زمین کی الاٹمنٹ اور ریاستی تعلیمی اداروں میں داخلوں میں ریاستی باشندہ کو درجہ بندی کے تابع ریاست کے سارے حقوق حاصل تھے۔

ریاست کے ہندوستانی حصے میں درجہ بندی کی تخصیص ختم کر کے تمام ریاستی باشندوں کا ایک ہی درجہ مقرر کیا گیا، اور ان کو Residential Subject لکھا جاتا ہے۔ اس طرح اس قانون کی روح یعنی ریاستی باشندوں کو باقی ہندوستانیوں پر ترجیح حاصل ہے لیکن اندرون ریاست سارے برابر ہیں۔ گلگت بلتستان میں یہ قانون ختم تو نہیں ہوا لیکن اس پر عمل درآمد ختم ہو گیا ہے جبکہ آزاد کشمیر کے اندر یہ قانون اس شکل میں بحال ہے جو 1927 میں نافذ کیا گیا تھا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شہریت کا قانون ہے، حالاں کہ لفظ Subject اور درجہ بندی سے واضح ہے کہ آقا، مالک یا حکمران نے اپنے محکوموں یا غلاموں کے حقوق کے معاملہ میں درجہ بندی مقرر کی ہوئی ہے۔ یہ شہریت نہیں ہے۔ شہریت اس وقت ہندوستان اور آج بھی ہندوستان کے زیر انتظام لوگوں کی ہندوستانی اور پاکستان کے زیر انتظام لوگوں کی پاکستانی ہے کیوں کہ یہ دونوں حکومتیں برٹش انڈیا کی قائم مقام حکومتیں ہیں۔ جب تاج برطانیہ نے ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ

کیا تو اس کو ہندوستان اور پاکستان دو ملکوں کی صورت میں ہندو اور مسلمان آبادی کی اکثریت کے اصولوں کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تھا۔ کشمیر مسلم اکثریتی ریاست ہونے کے ناتے پاکستان کے ساتھ آنا چاہیے تھی لیکن بین الاقوامی اور اندرون ملک ڈپلومیسی، ہندو لیڈروں کی متحرک سفارتکاری اور پاکستانی لیڈروں کی کوتاہی کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔ نتیجتاً کشمیر کی وہ تقسیم وجود میں آئی جس کی سزا آج تک ریاست جموں وکشمیر کے سارے لوگ بھگت رہے ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ اگر برطانیہ جنگ عظیم دوم میں خستہ حالی کا شکار نہ ہوا ہوتا تو نہ ہی ہندوستان اتنی آسانی سے آزاد ہوا ہوتا اور نہ ہی پاکستان وجود میں آیا ہوتا۔ مہاراجہ کے کشمیر چھوڑنے کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ مقامی طور پر مہاراجہ کی حکومت میں شمولیت اور زیادہ حقوق کی تحریک ہی ریاستی باشندوں کا منتہا نظر تھا ریاست کی آزادی کی تحریک نہیں تھی جیسا کہ اب یہاں کچھ لوگ کریڈٹ لے رہے ہیں۔ صوبہ کشمیر میں مرحوم شیخ عبداللہ کی لیڈرشپ کا سکہ چلتا تھا جبکہ جموں کے مسلم اکثریتی علاقوں میرپور، کوٹلی، پونچھ، وادی چناب، اور پیر پنجال میں مسلم کانفرنس کا اثر ورسوخ غالب تھا اور لوگ شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس کی قیادت میں تقسیم تھے۔ جبکہ اودھم پور سے لے کر کھٹوعہ تک ہندو غالب تھے۔ ریاست میں بسنے والے ہندو، سکھ، بدھ مسلمہ طور ہندوستان کے ساتھ جبکہ مسلمان پاکستان کے حق میں تھے لیکن حکمران فیصلہ کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ جو قتل وغارت اور تقسیم ریاست کا باعث بنا۔ ذاتی مفادات غالب آ گئے، کشمیر کی مسلمان لیڈرشپ کی آپس میں چپقلش اور تضادات بھی اس کی ایک وجہ تھی۔ جموں میں مغربی پنجاب سے جانے والے ہندوؤں، گورداس پور کو ہندوستان کو دیئے جانے والے ایوارڈ اور قبائلی لوگوں کا کشمیر میں داخلہ کے بعد مہاراجہ کو ہندوستان سے الحاق کرنا آسان ہو گیا، وگرنہ چناب عملی اور پتنی ٹاپ آئیڈیل تقسیم ہو سکتی تھی۔ جو اَب بھی ممکن ہے۔

جواہر لال نہرو کشمیری نژاد اور شیخ محمد عبداللہ مرحوم کے مفادات مشترکہ تھے کہ ہندوؤں اکثریتی علاقے اور کشمیری بولنے والے اکثریتی علاقوں کو بہر طور ہندوستان میں رکھنا ہے کیوں کہ ہندو جواہر لال نہرو کا حلقہ انتخاب جبکہ کشمیری بولنے والے شیخ عبداللہ کا محفوظ حلقہ انتخاب تھے۔ اس

حقیقت کا اعتراف زمینی حقائق کے علاوہ 1975 میں شیخ عبداللہ کا انٹرویو جو میں نے لیا تھا اور کلدیپ نیئر کی کتاب سے ہوتا ہے۔ شیخ صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا ریاست کے جو حصے ہمیں چاہیے تھے، وہ ہم نے قبضہ میں رکھ لیے اور اپنی افواج کو پیش قدمی سے روک دیا۔ کیوں کہ باقی علاقے Tribal and Turbulent تھے۔ کلدیپ نیئر نے لکھا ہے کہ اس وقت کے جنرل کلونت سنگھ نے اس کو انٹرویو میں کہا تھا کہ اسے ہندوستانی وزیراعظم جواہر لال نہرو کے احکامات تھے کہ کشمیری بولنے والے علاقوں سے آگے نہیں جانا ہے۔

میرا کشمیر کی تاریخ کے مطالعہ، دونوں طرف کے کشمیری لیڈروں اور لوگوں سے تعلقات، واقفیت اور معلومات سے ادراک ہے کہ شیخ عبداللہ ریاست میں غیر کشمیری بولنے والے لوگوں کو اپنی لیڈرشپ کے لیے چیلنج سمجھتے تھے۔ ان میں جموں کے ہندو بھی شامل تھے، جبکہ پنڈت جواہر لال نہرو، شیخ عبداللہ کو اور جموں کے ہندو اکثریتی علاقوں کو اپنے ساتھ اور پونچھ کے جنگ جو لوگوں کو الگ رکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس ملتے جلتے مفاد کی تکمیل کے لیے ریاست کی موجودہ تقسیم وجود میں آئی ہے جس کو آزاد کشمیر میں پونچھ، میرپور اور مظفرآباد کے لوگوں نے صوبہ سرحد کے قبائل کی مدد سے یقینی بنایا۔ اب سرحدی قبائل کا تو کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔ کریڈٹ دو پہاڑیوں، ''نیلہ بٹ'' اور ''جونجال ہل'' کے لوگ ہی لینا چاہتے ہیں جن کا اپنا حصہ یقینی طور پر ہے لیکن سرحدی قبائل کو الگ کریں تو کچھ نہیں ہوتا۔ گلگت بلتستان کی آزادی تو وہاں کے اسکاؤٹس، انگریز فوج کے میجر براؤن اور تمام لوگوں کی محنت کا ثمر ہے جس کے ساتھ آزاد کشمیر کی لیڈرشپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی لیے وہ اپنی علیحدہ حیثیت اور شناخت پر مصر ہیں حالاں کہ یہ علاقے مسلمہ طور پر مہاراجہ کشمیر کی قلمرو میں شامل ریاست جموں و کشمیر کا حصہ تھے۔

آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کا نظم ونسق

ریاست جموں و کشمیر کے جو علاقے اس وقت پاکستان کے زیر انتظام ہیں، ان میں

آزاد کشمیر 4144 مربع میل اور گلگت بلتستان 27946 مربع میل پر مشتمل ہیں جو مجموعی طور پر 32090 مربع میل ہیں۔ آزاد کشمیر 24 اکتوبر جبکہ گلگت بلتستان یکم نومبر 1949 کو آزاد ہوا ہے۔ دونوں علاقے الگ الگ انتظامی مشینری کے تحت حکومت پاکستان کی وزارتِ امورِ کشمیر کے زیر انتظام ہیں، البتہ دونوں علاقوں میں فی الوقت مقامی لوگوں پر مشتمل حکومت ہے۔ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے حوالے سے معاہدہ کراچی سیاسی اہمیت کا حامل ہے جو آزاد کشمیر اور حکومت پاکستان کے درمیان 28 اپریل 1949 کو کراچی میں ہوا جس کے تحت حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر اور اس وقت کی واحد سیاسی جماعت مسلم کانفرنس کے درمیان اختیارات کی تقسیم ہوئی، اس کی اہم ترین شق گلگت بلتستان کا نظم ونسق حکومت پاکستان کے زیر انتظام ہونا قرار پایا حالاں کہ یہ علاقہ یکم نومبر سے افواجِ پاکستان اور 15 نومبر سے سِول حکومت کے تحت چلایا جا رہا تھا۔ یہ معاہدہ محض صورتِ حال کو تسلیم کرنا تھا۔ اس معاہدے کی یہ اہمیت ضرور ہے کہ حکومت پاکستان نے گلگت بلتستان کو کشمیر کا حصہ تسلیم کیا جبکہ اس علاقے کے راجوں اور میروں نے حکومت پاکستان سے الحاق کر لیا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت جو اختیارات حکومت آزاد کشمیر اور مسلم کانفرنس کو دیئے گئے تھے، اگر ان خطوط پر آزاد کشمیر کا آئین ترتیب دیا جائے تو اس کی اندرونی خودمختاری یقینی ہو جائے گی۔ دونوں علاقوں کی مقامی حکومتیں آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر اور حکومت گلگت بلتستان کے نام سے موسوم ہیں۔ مقامی سطح پر دونوں علاقوں میں قانون ساز اسمبلی قائم ہے جس کے ممبران کی تعداد بالترتیب 49 اور 33 ہے۔ آزاد کشمیر کی اسمبلی کی 49 نشستوں میں سے 29 براہِ راست الیکشن کے ذریعے جبکہ 12 مہاجرین کشمیر مقیم پاکستان سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ آٹھ نشستیں خواتین کے لیے جبکہ ٹیکنوکریٹ کے لیے تین نشستیں بالواسطہ الیکشن کے ذریعے پر کی جاتی ہیں۔ یہ عوامی نہیں بلکہ حکومتی نمائندے ہوتے ہیں اور مہاجرین کی نشستیں اس صوبے کی حکمران جماعت لے جاتی ہے جس کی وہاں حکومت ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق آزاد کشمیر کے نفع ونقصان کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے نفع ونقصان سے ہے۔

گلگت بلتستان کی اسمبلی کی 33 نشستوں میں سے 24 براہ راست انتخاب کے ذریعہ منتخب کی

جاتی ہیں جبکہ 6 خواتین اور تین ٹیکنو کریٹ بالواسطہ منتخب کیے جاتے ہیں۔ بالواسطہ انتخاب کا طریقہ جمہوری روح کے خلاف عمل ہے جس کو عوامی نمائندے نہیں بلکہ حکومتی نمائندے کہا جاسکتا ہے۔ان اسمبلیوں کو جن معاملات پر قانون سازی کا اختیار دیا گیا ہے، ان پر انتظامی اختیار بھی مقامی حکومت کو حاصل ہے۔تاہم آزاد کشمیر اسمبلی کو گلگت بلتستان کی اسمبلی کے مقابلہ میں زیادہ اختیارات حاصل ہیں، دونوں کا نظم ونسق اور طریقہ حکومت پاکستانی صوبوں کی طرح کا ہے۔ البتہ اختیارات اور حقوق وہ حاصل نہیں ہیں جو پاکستانی صوبوں کو حاصل ہیں۔ حالاں کہ دونوں کو انتظامی طور پر پاکستان کا صوبہ تصور کیا جاتا ہے۔ دونوں علاقے پاکستان کے آئین میں براہِ راست شامل نہیں ہیں لیکن حکومت پاکستان کا ان علاقوں میں پاکستان کے باقی علاقوں کے مقابلہ میں بغیر جواب دہی کے زیادہ غلبہ ہے۔حکومت پاکستان ان علاقوں کو براہِ راست اور کونسل کے نام پر کنٹرول کرتی ہے جس کو آزاد جموں کشمیر کونسل اور گلگت بلتستان کونسل کہا جاتا ہے۔ یہ کونسل ان علاقوں کے ممبران اسمبلی کے ذریعہ منتخب کی جاتی ہیں جس کے بالترتیب 6 منتخب اور 6 غیر منتخب ممبران ہیں۔ وزیراعظم پاکستان اور پاکستان کی قومی اسمبلی کے 5 ممبرز کونسل کے ممبرز ہیں۔ان علاقوں کا کنٹرول عملی طور کشمیر کونسل کے جائنٹ سیکریٹری کے پاس ہے اور یہ شروع سے چلا آرہا ہے۔فرق صرف نام کا پڑتا رہا ہے۔کبھی اس کو ایڈوائزر کہتے تھے، آج کشمیر کونسل کہتے ہیں۔ جب سے گلگت بلتستان میں گورننس آرڈر 2009 نافذ کیا گیا ہے، اس وقت سے دونوں علاقوں کا نظام تقریباً ایک جیسا ہوگیا ہے۔دونوں علاقوں کی حکومت کے سربراہ زیادہ عرصہ سرکاری کام کاج اسلام آباد سے ہی انجام دیتے ہیں۔

ماسوائے صدر اور وزیراعظم کے، جن کا نام گلگت بلتستان میں گورنر اور وزیراعلیٰ ہے، باقی عملی طور کوئی فرق نہیں ہے۔ جو اختیار ان علاقوں کی مقامی حکومتوں کے پاس بھی ہیں، ان کا کنٹرول بھی پاکستان بیوروکریسی کے پاس ہے جن میں چیف سیکریٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، سیکریٹری فنانس، اکاؤنٹ جنرل، آڈیٹر جنرل، سیکریٹری پلاننگ شامل ہیں۔ان لوگوں کی مرضی کے بغیر پتہ تک نہیں ہل سکتا۔ پاکستان کے باقی صوبوں میں بھی بیوروکریسی نظام ایسا ہی ہے، تاہم وہاں مرکزی بیوروکریسی

صوبوں کی مرضی اور صوابدید پر تعینات کی جاتی ہے اور ان کی خوشنودی پر ہوتی ہے۔جبکہ ان علاقوں پر ٹھونسی جاتی ہے۔

عدلیہ کے حوالے سے بھی نام کا فرق ضرور ہے۔ آزاد کشمیر میں سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ ہے جبکہ گلگت بلتستان میں اس کا متبادل نام سپریم اپیلیٹ کورٹ ہے جس کے اختیارات آزاد کشمیر کی سپریم کورٹ سے زیادہ ہیں۔ ہائی کورٹ کا گلگت بلتستان میں متبادل نام چیف کورٹ ہے۔ ہر دو علاقوں میں ان عدالتوں میں ججوں کی تقرریاں کونسل کی ہدایت پر ہوتی ہیں۔ ہر دو علاقوں کی آئینی دستاویزات کے تحت حکومت پاکستان کو بالادستی حاصل ہے اور وہ کسی بھی وقت کوئی بھی ایسا حکم جاری کرسکتی ہے اور کیے ہیں جس کے تحت ان علاقوں کے منتخب ایوان اور عہدے دار برطرف کیے جاتے رہے ہیں۔ 1977 میں سردار محمد ابراہیم جبکہ 1991 میں راجہ ممتاز حسین راٹھور کو برطرف کیا گیا۔گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کے سیاست دان وزارتِ کشمیر سے مل کر یا اس کی سازش سے حکومتیں بناتے بگاڑتے ہیں۔مقامی سطح پر بیوروکریسی اور سیاست دانوں پر ایجنسیاں حاوی رہتی ہیں کیوں کہ لوگوں کی اپنی کمزوریاں ہوتی ہیں تاہم اگر مرکزی حکومت موثر ہو اور ساتھ دے تو ایجنسیاں غیر موثر ہو جاتی ہیں۔ چوں کہ مقامی سیاست دانوں کی مرکزی حکومت میں کسی سطح پر نمائندگی نہیں ہے، اس لیے ان کا مرکز میں کوئی اثر ورسوخ اور کنٹرول نہیں ہے۔ یہ خلا مرکزی ایجنسیاں اور مرکزی جماعتیں پُر کرتی ہیں جو کسی کے پاس جواب دہ نہیں۔ اس کے باوجود لوگ مقامی اداروں کے مقابلے میں مرکزی ایجنسیوں سے انصاف کی زیادہ توقع رکھتے ہیں۔

مرکز کی تمام سیاسی جماعتیں ان دونوں علاقوں میں موجود ہیں۔ان کے اور مہاجرین مقیم پاکستان کے ذریعے مقامی سیاست دان مرکز میں اپنا اثر ورسوخ بناتے ہیں۔ان کی وہاں کوئی قانونی اور آئینی حیثیت نہیں ہے۔مجموعی طور 1970 کی فوجی حکومت اور پاکستان پیپلز پارٹی نے ان علاقوں کو بااختیار کرنے کے لیے بہت کام کیا ہے جس کی وجہ سے آزاد کشمیر کو ایکٹ 1970 اور پھر عبوری آئین ایکٹ 1974 ملا جس کے تحت موجودہ ادارے قائم ہیں اور بنیادی حقوق بھی حاصل ہیں جبکہ گلگت

بلتستان میں 2005اور پھر 2009 کے گورننس آرڈر کے تحت موجودہ جمہوری ادارے قائم کیے گئے ہیں۔مرکزی حکومت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ان علاقوں کی حکومتیں بھی بدل دی جاتی ہیں۔تاہم پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نواز کے درمیان (COD (Charter of Democracy کے بعد یہ ریت دیکھنے میں نہیں آتی لیکن مقامی حکومتیں مرکز میں دوسری جماعتوں کی حکومتیں ہونے کی صورت میں بے اثر ہو جاتی ہیں اور مرکز نواز جماعتیں مختلف سطحوں پر اکاموڈیٹ ہوتی رہی ہیں۔ان دونوں علاقوں کا نظم ونسق پاکستانی صوبوں کی طرح چلایا جارہا ہے۔ذمہ داریاں ان سے زیادہ ہیں لیکن وہ حقوق حاصل نہیں جو پاکستان کے صوبوں کو حاصل ہیں۔گلگت بلتستان کے لوگ تو پاکستان کے ساتھ مکمل ادغام چاہتے ہیں جہاں کی اسمبلی نے قراردادیں بھی پاس کی ہیں۔جبکہ آزاد کشمیر کے چند لیڈر آزاد کشمیر کو ایسا ہی رکھنے کے حق میں ہیں تاکہ رائے شماری کی صورت میں ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ سودا بازی کی جائے۔اور اس وقت تک مرکز میں یہ لوگ اپنی مقامی سیاسی حیثیت کا براہ راست اور بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔اور آزاد کشمیر کے عام لوگ مرکز کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان لیڈروں کے مرہونِ منت ہیں بلکہ لیڈروں کی بھی رسائی نہیں ہے۔پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت سے تو آزاد کشمیر کے لوگوں کے براہ راست تعلقات ہیں لیکن مسلم لیگ کے مرکزی لیڈروں تک آزاد کشمیر کے کارکنان کی رسائی نہیں ہے۔جن لوگوں کی مرکزی حکومت میں رسائی ہے، وہ آزاد کشمیر کی حکومت سے ہر وہ جائز و ناجائز کام کروا سکتے ہیں، جن کا ہونا آزاد کشمیر والوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا، اس سلسلے میں سمند پار آباد کشمیری یدطولیٰ رکھتے ہیں کیوں کہ وہ پاکستانی لیڈروں اور بیوروکریسی پر خرچہ کرتے ہیں۔حتمی طور جو ہونا ہوگا ہو جائے گا لیکن اس وقت تک ان حقوق سے محروم رہنا جو پاکستان کے باقی لوگوں کو حاصل ہیں، غیر منصفانہ اور غیر منطقی بات ہے۔میرے خیال میں یہ اس لیے کیا جارہا ہے کہ آزاد کشمیر کے عام لوگوں کی مرکز میں رسائی نہ ہو اور چند لوگوں کا نظام قائم رہے، جن کے ذریعہ یہاں کے لوگوں کو کنٹرول کیا جائے۔یہ عمل شدید بدگمانیاں پیدا کر کے علیحدگی پسندی کے رجحان کو بڑھا رہا ہے جو پاکستان کی قومی سلامتی کے لیے سنگین خطرہ ہے۔

یہ دونوں علاقے پاکستان کے آئین کے تحت حصہ نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو پاکستان کا صوبہ سمجھتے ہیں اور دونوں علاقوں کی 99 فیصد سے زیادہ آبادی پاکستان کے حق میں ہے۔کچھ لوگ خودمختار کشمیر کے حق میں ہیں، البتہ ہندوستان کے مکمل طور خلاف ہیں۔آزاد کشمیر پر حکومت پاکستان اس حد تک حاوی ہے کہ نہ صرف وزیراعظم اور صدر اپنی مرضی کے بنوا لیتی ہے جیسے جنرل عبدالرحمان، جنرل محمد حیات خان، جنرل انور خان جو پاکستانی فوج کے حاضر سروس آفیسرز کو قانون میں ترمیم کر کے آزاد کشمیر کا صدر منتخب کروا دیا گیا۔2016 کے اسمبلی الیکشن کے بعد پاکستانی فارن سروس کے ایک آزاد کشمیر نژاد شخص کو سروس سے استعفیٰ دلا کر صدر منتخب کروایا جس کا آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کی سیاست سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور اس کا ووٹ اور دیگر قانونی لوازمات بھی جعلی اور فرضی طریقے سے عمل میں لائے گئے۔نہ معلوم یہ مقامی لیڈرشپ پر اعتماد کا فقدان ہے یا پاکستان کی حکومت وقت کے مفادات کا تحفظ، لیکن آزاد کشمیر کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق ہے اور اس پر حیرت یہ ہے کہ آزاد کشمیر کے لیڈر اس کا کریڈٹ لیتے ہیں کہ یہ ان کے کہنے پر ہوا۔گلگت بلتستان میں بھی گورنر کسی غیر مقامی شخص کو مقرر کیا جا سکتا ہے۔نہ جانے یہ گناہ بے لذت کیوں کیے جاتے ہیں۔اگر براہ راست صوبوں کی طرز پر کیا جاتا تو اس کے پاکستان کے حق میں بہتر نتائج نکلتے اور لوگ بھی فوائد سے مستفید ہوتے۔ایسے حالات میں قومی دھارے میں شامل ہونے میں کیا امر مانع ہے؟ گورنر سے متعلق وہاں کے قانون میں درج ہے کہ جس شخص کا ووٹ گلگت بلتستان یا پاکستان کے کسی حلقے میں درج ہوگا، وہ گورنر مقرر کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے آئین کے تحت براہ راست پاکستان کا حصہ نہ ہونے کے باوجود ریاست کے یہ دونوں حصے عملاً پاکستان ہیں۔اور ان کی اندرونی خودمختاری پاکستانی اسٹیبلشمنٹ، پاکستانی سیاسی جماعتوں، پاکستان میں مقیم کشمیری باشندوں کی آزاد کشمیر اسمبلی میں نمائندگی (یہ گلگت بلتستان میں نہیں ہے) حکومت پاکستان کے براہ راست اور بذریعہ کونسل اختیارات کے ذریعے مداخلت کی وجہ سے محض سطحی ہے۔اب حریت کانفرنس بھی آزاد کشمیر کی حکومت کی فیصلہ سازی پر حاوی ہے۔ان دونوں علاقوں میں حکومت بنانے اور چلانے کا راستہ اسلام آباد مری اور راولپنڈی کے ذریعے ہو کر جاتا ہے۔قانون

سازی کے عمل میں آزاد کشمیر کا دائرہ قدرے وسیع ہے، تاہم پاکستانی صوبوں یا مرکز کے ایسے قوانین جو آزاد کشمیر کے دائرہ کار میں آتے ہوں ان کے ساتھ ''آزاد کشمیر'' کا اضافہ کر کے یا Adopt کیا جاتا ہے یا اس کی نقل کی جاتی ہے، جیسے ''آزاد پینل کوڈ'' آزاد کشمیر تعزیری قوانین وغیرہ۔ گلگت بلتستان میں 99 فیصد مرکزی قانون نافذ ہیں۔

ہندوستانی زیر انتظام جموں وکشمیر

ریاست جموں وکشمیر کا جو علاقہ ہندوستان کے زیر کنٹرول ہے اس میں صوبہ کشمیر 6839 مربع میل، صوبہ جموں 9880 مربع میل' اور لداخ صوبے 24569 مربع میل ہے جو مجموعی طور پر 41268 مربع میل بنتے ہیں۔ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کی اس وقت آبادی ایک کروڑ 39 لاکھ ہے جس کی غالب اکثریت مسلمان ہیں۔ وادی کشمیر میں 95% لداخ میں 71% جبکہ جموں میں 22% مسلمان آباد ہیں۔ ریاست کے اس حصے میں 1947 کے آئینی خلا کو 1939 کے آئین کے تحت مناسب ترامیم کے ساتھ پُر کیا گیا تھا جو 1957 تک قائم رہا جب ریاست کی آئین ساز اسمبلی نے نیا آئین نافذ کیا۔ ریاست میں 1965 تک صدر ریاست اور وزیر اعظم کا عہدہ قائم رہا لیکن اس کے بعد ان ناموں کو گورنر اور وزیر اعلیٰ کے نام میں بدل دیا گیا۔ تاہم ان پر تقرری اور انتخاب مقامی آئین 1957 کے تحت ہی ہوتا ہے، گورنر کی تقرری صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعلیٰ کا انتخاب مقامی اسمبلی کرتی ہے۔ مقامی سطح پر مقننہ کے دو ایوان ہیں۔ جن کو بالترتیب قانون ساز اسمبلی اور قانون ساز کونسل کہا جاتا ہے، اسمبلی کی مدت چھے سال ہے۔ دونوں کشمیر کے آئین کی پیداوار ہیں۔ اسمبلی 111 ارکان پر مشتمل ہے جن میں سے 24 نشستیں پاکستانی زیر انتظام کشمیر کے علاقوں کے لیے خالی رکھی گئی ہیں۔ یہ انتظام غالباً سلامتی کونسل کی اس تشریح کے مطابق کیا گیا ہے کہ ریاست کی نمائندہ سرینگر کی حکومت جموں وکشمیر ہے۔ بقیہ نشستوں میں سے دو خواتین کے لیے مختص ہیں۔ قانون ساز کونسل کے ممبران کی کل تعداد 36 ہے جن کا انتخاب مختلف علاقوں اور طبقوں سے بالواسطہ عمل میں لایا جاتا ہے۔ ریاستی حکومت کے مرکزی دفاتر

نومبر سے اپریل تک جموں اور مئی سے اکتوبر تک سرینگر میں ہوتے ہیں۔ یہ پریکٹس میرے خیال میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے سے رائج ہے۔

سوائے مالیاتی معاملات کے کشمیر اسمبلی کے اختیار میں آنے والا کوئی بھی معاملہ دونوں میں سے کسی بھی ہاؤس میں قانون سازی یا کسی دیگر مقصد کے لیے اٹھایا جا سکتا ہے۔ جبکہ مالیاتی معاملات کا بل صرف اسمبلی میں پیش ہو سکتا ہے۔ وزیر اعلیٰ کے انتخاب میں مرکزی حکومت اسی طرح اثر انداز ہوتی ہے جس طرح آزاد کشمیر میں گلگت بلتستان میں تاہم چوں کہ اس حصہ کی نمائندگی ہندوستانی پارلیمنٹ میں ہے، اس لیے اس قدر جارحانہ مداخلت کرنا مشکل ہے۔

صوبہ بنانے کے باوجود ہندوستان کے آئین کا وہ حصہ جو ریاستوں کے نظم ونسق سے متعلق ہے، اس کا اطلاق ریاست جموں وکشمیر پر نہیں ہوتا۔ تاہم ہندوستان کے آئین کا وہ حصہ جو مرکزی اداروں کی نسبت ہے، اس کا اطلاق ریاست پر ہندوستان کے آئین کی دفعہ 370 کے تحت کیا جاتا ہے۔ دفعہ 370 کے تحت ہندوستانی آئین میں دفعہ 35A کا اضافہ کیا گیا ہے جس کے تحت ریاستی باشندوں کے خصوصی حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے۔ اس کی موجودگی میں ہندوستان کے باقی باشندے ریاست کے اندر برابر کے حقوق نہیں رکھتے جس کے خاتمہ کے لیے BJP اور کشمیری پنڈت اب کمربستہ ہیں۔ مرکز کے وہ اختیارات جو الحاق نامہ میں درج ہیں، مقامی حکومت کے مشورے اور دیگر امور مقامی حکومت کی رضامندی سے آئینی ترمیمی حکم کے ذریعہ صدر ہندوستان نافذ کرتے ہیں۔ اس میں ہندوستانی پارلیمنٹ کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر ریاست اور مرکز کے درمیان رشتہ دفعہ 370 کے تحت قائم ہے۔ دفاع، خارجہ، مواصلات، کرنسی اور ان سے منسلک معاملات براہ راست ہندوستان کے اختیار میں ہیں۔ آزاد کشمیر کے برعکس مرکز کے تمام اداروں' سپریم کورٹ، الیکشن کمیشن وغیرہ کا اطلاق کشمیر پر براہ راست ہوتا ہے۔ مرکزی سیاسی جماعتیں ریاست میں اسی طرح متحرک ہیں جس طرح باقی ہندوستان میں جن میں نمایاں نیشنل کانگریس اور بھارتی جنتا پارٹی (BJP) ہیں۔ ان کی کشمیر اسمبلی اور ہندوستانی پارلیمنٹ میں نمائندگی بھی موجود رہتی ہے مقامی سطح پر نیشنل کانفرنس (NC) اور پیپلز ڈیموکریٹک

پارٹی (PDP) کافی مقبول ہیں جن کی اعانت یا معاونت کے بغیر ریاست میں مقامی حکومت نہیں بن سکتی۔ صوبہ کشمیر اور جموں کے مسلم اکثریت کے علاقوں میں (NC) اور (PDP) اور کانگریس کے مسلم امیدوار ہی عمومی طور پر منتخب ہوتے ہیں جبکہ جموں کے ہندو اکثریتی علاقوں میں (BJP) اور کانگریس کے ملے جلے امیدوار منتخب ہوتے ہیں۔ دو مقامی بڑی جماعتوں سے کسی ایک کے ساتھ مل کر مرکز کی ریاست میں اکثریت کی حامل کوئی بھی جماعت حکومت بنا لیتی ہے۔ ریاست میں مسلمانوں کے اندر مقبول ترین سیاسی اور ملی جماعتوں کا اتحاد آل پارٹیز حریت کانفرنس (APHC) ہے، الیکشن میں نہ صرف یہ کہ حصہ نہیں لیتی، بلکہ الیکشن کے بائیکاٹ کی باضابطہ مہم بھی چلاتی ہے۔ لیکن عام لوگ ان کے ساتھ تمام تر ہمدردیوں کے باوجود الیکشن میں حصہ لیتے ہیں۔ اور اس حد تک حریت کانفرنس کا عوام پر کوئی اثر نہیں ہے کیوں کہ نمائندوں کے ذریعہ اپنے مقامی مسائل کا حل اور حریت کے ذریعہ خودمختاری چاہتے ہیں۔

1990 کی منظم مزاحمتی تحریک کے بعد کشمیر میں حکومت کی گرفت ڈھیلی اور فوج کی مضبوط ہوگئی ہے۔ تاہم مقامی معاملات میں سول ایڈمنسٹریشن کے پاس فوج بھی جواب دہ ہے۔ ریاست سے مرکزی پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہونے والے لوگ مرکز میں اہم وزارتوں کے حامل بھی ہوتے ہیں اور صوبائی ہائی کورٹ کے کئی ججز سپریم کورٹ آف انڈیا کے جج بھی بن چکے ہیں جو آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان علاقوں کے لوگوں کے مرکز کے ساتھ تعلقات استوار اور اثر و رسوخ کافی ہے۔

کشمیر کی مزاحمتی تحریک کے بعد ہندوستان کے لوگ اب کشمیریوں پر اس طرح اعتماد نہیں کرتے جیسا کہ اس سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ صوبہ کشمیر کے لوگوں سے صوبہ جموں اور لداخ کے لوگ اکثر شاکی رہتے ہیں جبکہ وادی کشمیر کے اندر بھی کشمیری زبان نہ بولنے والے گوجروں اور پہاڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ خلیج روز بروز وسیع تر ہوتی جارہی ہے یا کی جارہی ہے۔۔ گوجروں کو ہندوستانی آئین کے تحت شیڈول کاسٹ قرار دے کر ہر معاملہ میں ترجیح دی جاتی ہے جبکہ پہاڑی لوگ بھی اپنے لیے ایسا ہی مقام طلب کررہے ہیں۔ مقامی ہائی کورٹ کو کشمیر اور ہندوستان کے آئین کے

تحت الگ الگ اختیارات حاصل ہیں۔ مرکزی بیوروکریسی اس حصے میں[341] بھی مضبوط ہے لیکن حکومت کشمیر کے ملازم ہیں۔ کشمیر کی حکومت ریاست میں موجود ہندوستانی بیوروکریسی میں سے خود چیف سیکریٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس مقرر کرتی ہے۔ گو کہ یہ انڈین سروس کے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے اندر ریاست جموں وکشمیر کو وہ تمام اختیارات اور حقوق حاصل ہیں جو ہندوستان کی باقی ریاستوں کو حاصل ہیں لیکن ریاست کے اندر حکومت کو ہندوستانی ریاستوں سے زیادہ حقوق حاصل ہیں۔

مستقبل کے بارے میں لداخ اور جموں کی غیر مسلم آبادی مکمل طور ہندوستان کے حق میں جبکہ مسلمان آبادی مکمل طور ہندوستان کے خلاف ہے۔ ان کی رائے پاکستان اور خودمختار کشمیر کے حق میں منقسم ہے، اس لحاظ سے ریاست کی غالب اکثریت ہندوستان کے خلاف ہے البتہ علاقائی تقسیم میں جموں اور لداخ میں اکثریت ہندوستان کے حق میں جبکہ صوبہ کشمیر مکمل طور ہندوستان کے خلاف ہے۔ مقامی حکومت اور ترقیاتی کاموں کی حد تک لداخ اور کارگل کی مقامی کونسلز تقریباً خودمختار ہیں جن کو حکومت کشمیر اور حکومت دہلی سے بھرپور مالی وسائل مہیا ہیں۔ یہاں کے لوگ ان علاقوں کو براہ راست مرکز میں رکھنے کے حق میں ہیں۔ کشمیر میں حکومت سازی کا راستہ دہلی سے ہوکر آتا ہے۔ مقامی مقبول جماعتیں مرکز کی کسی جماعت کی مدد کے بغیر حکومت نہیں بنا سکتیں۔ مرکزی معاملات میں مرکزی سرکار کے لوگ حاوی ہیں۔ مرکزی معاملات کے حوالے سے ہندوستانی آئین کی 395 دفعات میں سے 260 اور 97 آئینی اختیارات کی انٹریز سے 95 کا اطلاق کشمیر میں کیا گیا ہے۔

اس وقت سات لاکھ ہندوستانی فوج کی موجودگی میں ریاست تو مکمل طور فوجی چھاؤنی ہے۔ جمہوری اور سیکولر ملک ہونے کے دعویٰ کے باوجود ہندوستان کی جمہوریت کشمیر کے حوالہ سے لکھنپور جبکہ سیکولرازم بانہال میں ختم ہوجاتا ہے۔ مختلف سیاسی، قانونی اور انتظامی اقدامات کی وجہ سے ریاست میں آبادی کا تناسب تبدیل کیا جارہا ہے۔ جیسا کہ غیر ریاستی مہاجرین اور کاروباری لوگوں کو آباد کرکے، کالجوں اور سکولوں میں ہندوستانی طلباء کی تعداد بڑھا کر، ہندوستانی ریٹائرڈ فوجیوں کے لیے رہائشی

کالونیاں بنا کر، ہندوستانی فوج، پیرا ملٹری فورس میں مقامی نوجوانوں کو بھرتی کر کے اور مقامی طلبا کو ہندوستان یاترا کروا کران کا ذہن تبدیل کیا جارہا ہے۔

ہر فوجی چھاؤنی اور کیمپ کے ساتھ مندر بنا کر ہندو تہذیب کا غلبہ کیا جارہا ہے۔ سرکاری دفاتر اور اہم اہمیت کی حامل عمارات پر ہندی زبان میں بورڈ آویزاں کیے جارہے ہیں۔ اردو رسم الخط کو دیوناگری میں بدلنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ صنعتی ترقی کے نام پر غیر ریاستی باشندوں کو سرکاری زمینیں دی جارہی ہیں۔ ریاست میں مرکزی دفاتر میں ہندوستانی غیر کشمیریوں اور کشمیری پنڈتوں کو بھرتی کیا جارہا ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں 1990 کی مسلح جدوجہد اور آزاد کشمیر

ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کے 1987 کے اسمبلی انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کے نتیجے میں وہاں پر انتخابی اتحاد Muslim United Front(MUF) (مف) کو ہندوستان اور فاروق عبداللہ کی انتظامیہ نے خلاف توقع ہروانے کے بعد، وسیع پیمانے پر مظاہرے اور احتجاج ہوئے جنہوں نے شدت اختیار کرتے ہوئے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ یہ تحریک بالآخر مسلح جدوجہد میں بدل گئی۔ مسلم یونائیٹڈ فرنٹ (MUF) کی بنیاد 1986 میں گورنر جگموہن کے اس حکم کے بعد پڑی جب اس نے ہندو تہوار جنم اشٹمی والے دن بھیڑیں ذبح کرنے پر پابندی عائد کی جس کے خلاف مسلم آبادی یک جان ہوگئی اور سرعام اس حکم کی خلاف ورزی سڑکوں اور چوراہوں پر بھیڑیں ذبح کر کے کی۔ اس تحریک میں وادی کشمیر کی مسلم آبادی مکمل طور پر شامل تھی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ انہوں نے ووٹ مف (MUF) کو دیئے تھے لیکن نتائج کانگرس اور نیشنل کانفرنس کے حق میں مرتب کیے گئے۔

کشمیر کی انتخابی تاریخ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہاں انتخابی نتائج ہمیشہ ہندوستانی حکومت کی مرضی کے مطابق ہی مرتب کیے جاتے رہے۔ 1967 تک 90% نیشنل کانفرنس اور کانگرس کے امیدوار بلا مقابلہ منتخب قرار دیئے جاتے رہے جبکہ اس کے بعد کچھ خلا تو رہی لیکن غیر سرکاری جماعتوں کے خلاف

منتخب ہونے والے لوگوں کو بے اثر بنایا جاتا رہا جیسا کہ 1972 کے الیکشن[341] میں جماعت اسلامی کے چند لوگ کامیاب ہوئے لیکن ان کو فرائض منصبی میں ناکارہ بنا کر رکھ دیا گیا۔ مرکز اور اس کی ہم خیال مقامی سیاسی اور انتظامی مشینری کے خلاف یہ لاوا 1947 سے ہی پکتا چلا آرہا تھا جو 1987 کے الیکشن کے نتائج کے بعد پھٹ گیا۔ اس نے ہندوستان مخالف تحریک کی صورت اختیار کر لی، چنانچہ اب معاملہ انتخابی نتائج میں دھاندلی نہیں بلکہ ہندوستان کے کشمیر پر قبضہ کے خلاف آزادی کی تحریک بن گیا جس کو بہ زور فوج دبانا ہندوستان کے لیے ناگزیر ہوگیا۔ اس وجہ سے فوج اور عوام ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوگئے۔ اگر اس الیکشن میں دھاندلی نہ کی گئی ہوتی MUF بمشکل 10/12 اسمبلی کی نشستیں لیتی اور ان کی حیثیت ویسی ہی ہوتی جیسی 1972 کی اسمبلی میں جماعت اسلامی کے ممبروں کی ہوگئی تھی۔ نہ حریت کونسل بنتی نہ جہاد کونسل۔ نہ ہندوستان بدنام ہوتا، نہ کشمیر کی آزادی کی سیاسی تحریک دہشت گرد کہلاتی اور نہ ہی پاکستان کو ان کی وجہ سے دہشت گرد کہا جاتا۔ لیکن اس وجہ سے دنیا کی توجہ برصغیر پر ضرور مرکوز ہوگئی۔

پاکستان کے لیے یہ آزمائش کا لمحہ تھا ایسے حالات میں وہ کشمیریوں کو ہندوستانی فوج کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ نتیجتاً پاکستان کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے دباؤ میں آکر حکومت پاکستان نے بھی کشمیر سے آنے والے نوجوانوں اور خاندانوں کے لیے سرحدیں اور ملک کو کھول دیا۔ پاکستان میں تربیت یافتہ لوگوں کی کبھی کمی نہ رہی، بالخصوص افغان جہاد میں امریکہ کی مدد سے پاکستان میں ہزاروں لوگ فوجی تربیت حاصل کرنے کے علاوہ مختلف قسم کے اسلحہ سے لیس تھے۔ پاکستان میں جہادی تنظیمیں مختلف ناموں سے کام کرتی تھیں اور مقبوضہ کشمیر میں بھی متعدد ناموں سے جہادی تنظیمیں بنائی گئیں جو اپنے جوانوں کو تربیت اور اسلحہ کے لیے پاکستان بھیجتے رہے۔ پاکستان سے میری مراد آزاد کشمیر ہے کیوں کہ 99 فیصد کشمیری لوگ آزاد کشمیر میں ہی داخل ہوتے رہے۔ مظفر آباد میں آٹھ مقام اور لیپہ، پونچھ میں عباس پور، ہجیرہ کوٹلی میں مختلف مقامات سے لوگ بہ آسانی سرحد عبور کر کے پاکستان آ گئے جہاں ان کو مقامی آبادی نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ ہندوستانی اخباروں اور بے شمار مصنفین نے لکھا ہے کہ ہندوستانی فوج، خفیہ ایجنسیاں اور بارڈر سکیوریٹی فورس، رشوت لے کر سرحد عبور کرنے کی سہولت

فراہم کرتی تھیں جس وجہ سے آنا جانا بلا روک ٹوک تھا۔

ان کی پناہ، دیکھ بھال، کھانے پینے کے لیے حکومتی مدد کے علاوہ مقامی آبادی نے بھی بھر پور حصہ لیا۔ آزاد کشمیر حکومت نے مرکزی ایجنسیوں کے ذریعہ ان کو آزاد کشمیر میں مختلف جگہوں پر پناہ دی۔ اس کا بندوبست مقامی حکومت کرتی رہی۔ ان لوگوں کو آزاد کشمیر میں حریت پسند، مجاہد، پناہ گزین، بندوق بردار جنگ جُو آزادی پسند کے طور پر پکارا جانے لگا۔ ان کے ساتھ ہی مقبوضہ کشمیر کی سرحدی آبادی کے لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں پاکستان ہجرت کرنا شروع کر دی کیوں کہ سرحد پر شدید فوجی دباؤ، ان کے مسلمان ہونے، سرحد کے دونوں طرف رشتہ داریوں کی وجہ سے ان کو بلا تخصیص تخریب کار سمجھا جانے لگا جس وجہ سے ان کو جان اور عزت بچانے کے لیے مضبوط پناہ گاہ پاکستان ہی میسر تھی۔ عورتوں، مردوں بچوں، بوڑھوں کی ہجرت کی وجہ سے آزاد کشمیر پر شدید دباؤ بڑھ گیا جس وجہ سے ان کی آبادکاری کا نظام مرکزی ایجنسیوں نے اپنے ہاتھ میں لیا اور مختلف جگہوں پر مہاجر کیمپ کے نام سے بستیاں بسائیں جہاں ان لوگوں کو محفوظ پناہ گاہیں میسر آئی۔ حریت پسند یا مجاہد بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے سرحد پار سے آنے والے مجاہدین کو بھی اپنے لوگوں میں پناہ میسر آئی جنہوں نے سرحد کے دوسری طرف آنا جانا شروع کر دیا۔

مرکزی خفیہ اداروں کی مدد کے علاوہ آزاد کشمیر کے ترقیاتی بجٹ کا کافی حصہ ان کی دیکھ بھال کے لیے خرچ ہونے لگا۔ میری ذاتی علمیت میں تو آزاد کشمیر میں کوئی تربیتی کیمپ نہیں لیکن یہ حقیقت میرے علم میں ہے کہ تربیت کی غرض سے آنے والوں میں سے جو میرے واقف کار تھے، وہ بتاتے تھے کہ جہادی تنظیمیں اور سرکاری ایجنسیاں چند دنوں یا ہفتوں کی ٹریننگ اور اسلحہ دیتی ہیں۔ بدقسمتی سے چند دنوں کی تربیت دے کر لوگوں کے ہاتھ میں بندوق تھمائی گئی اور جدید اسلحہ سے لیس دنیا کی ایک بڑی فوج کے ساتھ لڑنے کے لیے میدان میں اتار دیا۔ جب ابتدائی دنوں میں سیکڑوں کی تعداد میں پڑھے لکھے نوجوان آ رہے تھے، میں نے حکومت پاکستان کے ذمہ داروں کو تجویز دی کہ ان لوگوں کو پاکستان فوج یا نئی فورس بنا کر اس میں کھپا دیا جائے جو وقت آنے پر ضرورت آ سکتے تھے۔ ایسا تو نہیں ہوا

لیکن جو بچے یہاں جوان اور پیدا ہوئے، ان کو پاکستانی فوج میں بلا تفریق[341] بھرتی کیا جا رہا ہے جو اَب میجر کے رینک تک بھی پہنچ چکے ہیں۔

میں 1991 میں جوڈیشل سروس میں آ چکا تھا، اس لیے اس آزادی اور بے تکلفی سے سب کچھ نہیں دیکھ سکا لیکن وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے اکثر نوجوان میرے جاننے اور رشتہ دار خاندانوں کے چشم و چراغ تھے جن میں سے اکثر کا ٹھکانا میرے گھر میں ہوتا تھا۔ ان دنوں میں مظفر آباد کے پلیٹ محلہ میں رہتا تھا جس کے قریب ہی ان لوگوں کی نگہداشت اور آمد و رفت کے لیے محکمہ تعلیم کی ایک بہت بڑی سرکاری بلڈنگ مہیا کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ماکڑی کے مقام پر ایک دینی مدرسہ بھی تھا جس میں بھی ان کے لیے ایک کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ میرے مکان کی بالائی منزل خالی تھی جس کو میں نے جاننے والوں کے لیے کھول دیا جہاں ان کے کھانے پینے اور رہنے کا بندوبست بھی کیا اور ان میں سے ہی اپنے اعتماد کے کچھ لوگوں کو اس کا نگران مقرر کر دیا جو ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرتے تھے۔ کشمیر سے میرے واقف کار اور رشتہ دار لوگوں کے اکثر نوجوان میرے پاس آتے جاتے رہے۔

جب میں نے اپنی رہائش گوجرہ محلہ میں منتقل کی یہ لوگ کثیر تعداد میں وہاں بھی آتے جاتے رہے۔ چوں کہ اس مکان کے آس پاس فوجی دفتر تھے، جن کی ایجنسیوں نے میری نگرانی بھی شروع کر دی کہ یہ لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں۔ میری ڈیوٹی پر مامور پولیس کے ایک حوالدار کو اپنا مخبر بنا لیا جو روزمرہ کے آنے جانے والے لوگوں کی ان کو رپورٹ کرتا تھا۔ ایک روز یہ حوالدار میرے پاس آیا اور کہنے لگا میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں لیکن آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ گزشتہ نو مہینوں سے میری ڈیوٹی میں یہ بات بھی شامل تھی کہ آپ کے ہاں آنے جانے والے حریت پسندوں کی نگرانی کروں اور ان کے ساتھ آپ کی سرگرمیوں کی رپورٹ بھی دوں۔ یہ حوالدار ان لوگوں کی خورد و نوش کا بندوبست بھی کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں ہر روز یہ رپورٹ دیتا تھا کہ کتنے لوگ آئے اور کتنے کھانا کھا کر اور کتنے کھانا کھائے بغیر واپس گئے۔ میری رپورٹ عموماً یہ ہوتی کہ یہ لوگ اپنے دل کی بھڑاس اور آپ کی حوصلہ افزائی کے بعد چلے جاتے تھے۔ ہر روز کی یہی رپورٹ سن کر متعلقہ لوگوں نے

مجھے کہا کہ اب رپورٹنگ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان لوگوں کے آنے جانے کی وجہ سے یہاں کے مقامی لوگوں کو ہندوستانی کشمیر کی اندرونی کہانی جاننے اور لوگوں کو سمجھنے کا پہلی بار موقع ملا۔ لوگوں سے تعلقات استوار اور مضبوط ہو گئے۔ جبکہ ان لوگوں کو یہاں کی سوچ اور لوگوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت کا براہِ راست دیکھنے کا موقع ملا جس کی فرسٹ ہینڈ اطلاع پار والے لوگوں کو ملی اور آر پار ایک جیسا محسوس ہونے لگا۔ وگرنہ یہاں کے لوگوں کو کشمیر وادی کے لوگوں سے متعلق عجیب وغریب قسم کا تاثر دیا جاتا رہا تھا جو سیاسی مقاصد کی وجہ سے تھا۔

ان لوگوں کی وجہ سے مقبوضہ وادی کے لوگوں کا افواج پاکستان اور اس کی ایجنسیوں سے براہ راست رابطہ ہوا اور وہ خلیج پاٹ دی گئی جو سیاسی مقاصد کے لیے کچھ شعبدہ بازوں نے حائل کی ہوئی تھی اور ہر کشمیری کو ہندوستانی جاسوس جان کر مظفر آباد، دلائی اور مری کے عقوبت خانوں میں بند کروادیا جاتا تھا۔ پاکستانی فوج اور کشمیریوں کے درمیان فاصلے مٹ گئے۔ اب کشمیری فوج کے حوالے سے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ دونوں ایک جیسے محسوس ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان کو پہلے جاسوس کہہ کر حکومت کرتے تھے، اب ان کا سہارا لے کر حکومت بناتے اور فوج کی قربت حاصل کرتے ہیں۔

ان لوگوں کی وجہ سے ہمارے سرحدی علاقے کے لوگوں کو شدید مشکلات سے دوچار ہونا پڑا جو براہِ راست ہندوستان کی گولہ باری کا شکار رہے اور بے شمار قیمتی جانیں بھی ضائع ہوئیں۔ ہماری وادی نیلم تو کئی سال تک ہندوستانی فائرنگ کی وجہ سے مسدود رہی کیوں کہ اس علاقے کو جانے والی واحد سڑک ہندوستانی فوج کی شارٹ گن کے مغائر فائٹر کی زد میں ہے جو مکمل طور بند کی جاتی تھی۔ لوگوں کی زندگی اجیرن اور پوری وادی ایک قید خانہ بن گئی تھی۔ 1999 کی کارگل جنگ بندی کے بعد ہندوستان نے یہ سڑک بند نہیں کی۔ مجھے کچھ دوستوں نے بتایا ہے کہ کارگل کے علاقے سے لیہہ جانے والی سڑک کسی جگہ سے پاکستانی فوج کی زد میں آ گئی ہے جس وجہ سے ہندوستان وادی نیلم کی سڑک بند کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ نیلم وادی کے لوگ مجاہدین کے نام پر سرحد عبور کرنے کے شدید مخالف ہو گئے ہیں اور اکثر جلسے جلوس کے ذریعہ اس پر اظہار برہمی بھی کرتے ہیں۔

ان لوگوں کی آڑ میں آزاد کشمیر میں کوئی تخریبی کارروائی بھی نہیں ہوئی[341] جیسا کہ افغان مہاجرین کی وجہ سے پاکستان بھر میں ہوئی۔ مظفر آباد، کوٹلی اور باغ کے مختلف علاقوں میں کیمپ بنا کر ان بے گھر لوگوں کو بسایا گیا ہے جہاں ان کو ہر قسم کی سہولت میسر کی گئی ہے۔ حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر کے علاوہ بیرون ملک آباد کشمیری اور پاکستان بھر کے مخیر لوگ ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ اب ان کی دوسری بلکہ تیسری نسل بھی تیار ہو گئی ہے جو کشمیری کم اور پاکستانی زیادہ ہے۔ اگر حکومت پاکستان چاہے بھی ان لوگوں کی آئندہ تین نسلیں پاکستان کو کشمیر سے پسپائی اختیار نہیں کرنے دیں گی اور ان کی وجہ سے پوری پاکستانی قوم میں کشمیر کے حوالہ سے ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کے طلبہ کے لیے تعلیمی اداروں بالخصوص میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبے میں سیٹوں کا اہتمام کیا ہے جو ہندوستانی پاسپورٹ اور پاکستانی ویزے پر یہاں آ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ سال 2004 سے اس وقت تک سو بھر طلبہ ڈاکٹر اور انجینئر بن کر واپس کشمیر جا چکے ہیں یا یہاں سے ہی بیرون ملک چلے گئے ہیں۔ ان لوگوں کے جملہ اخراجات حکومت پاکستان برداشت کرتی ہے بلکہ ان کو جو اپنے لیے جیب خرچ ملتا ہے اس میں سے بچا کر اپنے والدین کو حج بھی کرواتے ہیں۔ ان میں سے اکثر لڑکے لڑکیوں کی پاکستان کے مختلف حصوں میں شادیاں بھی ہو چکی ہیں اور اس طرح ان کے ذریعہ پاکستان کے اکثر گھروں میں تحریک داخل ہو گئی ہے۔ ان کے حوالے سے کشمیر کے لوگوں کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔ کشمیر کے دونوں حصوں بلکہ پاکستان بھر کے کئی علاقوں کے لوگوں کی شادیاں آر پار ہونے لگیں۔ دہلی میں پاکستانی سفارت خانہ کشمیریوں کے حق میں فراخ دلی سے ویزا بھی جاری کرتا ہے۔ پاکستان نے کشمیر کے درمیان چلنے والی بس کے ذریعہ آنے والے لوگوں کو پورے پاکستان میں گھومنے پھرنے کی غیر سرکاری طور اجازت بھی دے رکھی ہے۔ اس طرح پاکستان نے کشمیریوں کو ہر سطح پر سہولت فراہم کی ہے۔ لیکن اب اس سہولت کو اس طرح مشکل بنایا جا رہا ہے کہ جس شخص کے ایڈریس پر یہ لوگ آتے ہیں ان سے لکھ کر لیا جاتا ہے کہ ان کو آزاد کشمیر سے باہر نہیں جانے دیا جائے گا۔ تاہم یہ محض رسمی کارروائی ہے۔

مجھے شروع سے ہی اس بات کا ادراک تھا کہ اس تحریک سے وہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے جس کا جذباتی طور پر کشمیری اور پاکستانی خواب دیکھتے ہیں اس لیے میں اکثر لوگوں کو پاکستان میں نارمل زندگی گزارنے کا مشورہ دیتا رہا۔ اس کی خاطر ان کو ریاستی باشندہ کے سرٹیفکیٹ، شناختی کارڈ، ووٹ کے اندراج کا اہتمام بھی کیا۔ ماشاءاللہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ پاکستان میں آباد ہو کر کشمیر میں اپنے رشتہ داروں کی کفالت کا اہتمام کرتے ہیں۔ کئی لوگ کاروبار میں کروڑ پتی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی وجہ سے پاکستان کا کشمیر میں اثر ورسوخ بھی بڑھ گیا ہے۔ سوائے مہاجر کیمپوں میں رہنے والوں کے باقی سب کشمیری پاکستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے ہیں اور حسب توفیق، استطاعت، ممکنہ تعداد مقبوضہ کشمیر کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ خوش حال ہیں۔ کشمیر کے ساتھ ان کی وابستگی بھی رسمی رہ گئی ہے، کیوں کہ اپنے اپنے کام کاروبار میں مگن ہو گئے ہیں اور نسلوں کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ پاکستانی ان کے لیے سب آسانیاں پیدا کر رہے ہیں۔

کشمیری مہاجرین کی آبادکاری اور حریت کانفرنس

ریاست کے ہندستانی مقبوضہ حصہ سے 1990 کے بعد ترک سکونت کر کے آزاد کشمیر میں آنے والے لوگوں کو یہاں مقامی طور پر مہاجر کہا جاتا ہے اور اس حیثیت میں ان کا غیر معمولی خیال رکھا جاتا ہے۔ حکومتی سطح پر ان لوگوں کے لیے ملازمتوں، تعلیمی اور فنی اداروں میں 5 فیصد کوٹہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس سے مجموعی طور سیکڑوں بچے بچیاں مستفید ہوئے ہیں۔ 1990 کے بعد آنے والے مہاجرین کی تعداد چھتیس ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو ماہوار دو ہزار روپیہ گزارا الاؤنس ملتا ہے۔ سکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے بچوں کو فی کس بالترتیب ڈیڑھ سو، دو سو اور تین سو روپے ماہوار جیب خرچ ملتا ہے۔ ان لوگوں کو حکومت نے رہائش کے لیے سرکاری زمین دی ہے جس پر مختلف این جی اوز نے ان کو مکان بنا کر دیئے ہیں جن میں کویت کا کردار نمایاں ہے۔ سو سے زیادہ لوگ 2014 تک پولیس میں نوکری پا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹیچرز، لیکچررز اور دوسری نوکریوں کا کوئی حساب

نہیں ہے۔ مختلف فنی اداروں میں تربیت پانے والوں کی 2014 تک تعداد 400 سے زیادہ ہے جن میں ایم بی بی ایس، بی ڈی ایس، ایم بی اے، ڈی وی ایم، آئی ٹی، انجینئرنگ وغیرہ کے طلبہ ہیں اور ان سب کو وظیفہ ملتا ہے جس سے ان کے سارے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں۔ یہ وظیفہ ان لوگوں کو 2004 سے ملنا شروع ہوا اور اسی سال سے مقبوضہ کشمیر کے طلبا کا بھی پاکستان آنا شروع ہوا۔ اس وقت تک مقبوضہ کشمیر کے 132 طلبہ کو ایم بی بی ایس میں داخلہ ملا ہے ان میں سے متعدد نے پوسٹ گریجویشن بھی کی ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے اس وقت تک 52 طلبا ایم بی بی ایس کر کے واپس بھی جا چکے ہیں۔ ان لوگوں کا داخلہ کشمیر کی حریت کانفرنس کی سفارش پر کیا جاتا ہے۔ یہ سیٹیں شہدا کے ورثا اور متاثرین جہاد کے لیے ہیں لیکن میرے علم میں ایسے کیسز بھی ہیں کہ کشمیر کے اعلیٰ ہندوستان نواز گھرانوں کے بچے بھی اس میں شامل رہے ہیں۔ مجھے سرینگر میں بتایا گیا کہ ان سیٹوں پر نامزدگی کے لیے وہاں حریت کانفرنس پر مالی لین دین کے الزامات بھی ہیں۔ مجھے 2015 جون کو سرینگر بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر رینزو صاحب نے یہ بات کہنے کے بعد طنزاً کہا کہ ''پاکستان کو اب اپنے Salesmen بدلنے چاہئیں۔''

کشمیر کے پسماندہ ترین علاقے کیرن کے اس وقت تک 32 ڈاکٹر اور 19 انجینئر بن کر سرکاری نوکری بھی حاصل کر چکے ہیں حالاں کہ کیرن میں رہتے ہوئے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں اکثر مجاہدین بھی کشمیر سے اپنی فیملی بلا کر اب پاکستان میں عام شہری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان لوگوں کے نام مہاجر کارڈ جاری ہو گیا ہے اور وہی سہولیات حاصل کرتے ہیں جو باقی مہاجرین کو حاصل ہیں اس کے علاوہ جس تنظیم سے یہ لوگ تعلق رکھتے تھے ان کی طرف سے بھی معاونت حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ پاکستان کے جس حصے میں بھی آباد ہیں اور جو بھی کاروبار کرتے ان کے ہر فرد کو ماہوار گزارا الاؤنس ملتا ہے۔ پاکستانی شناختی کارڈ حاصل کرنے کے بعد بے شمار لوگ پاکستان کے مختلف حصوں میں آباد ہو چکے ہیں جہاں ذاتی کاروبار کر رہے ہیں۔ میرے علم میں ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو کاروباری زندگی میں کروڑوں کی جائیداد کے مالک بن گئے ہیں اور پاکستان کے مختلف شہروں میں نمایاں سماجی اور سیاسی حیثیت کے حامل ہیں۔ حتیٰ کہ آزاد کشمیر اسمبلی کے ممبر بھی بن گئے ہیں۔ کئی لوگ

پاسپورٹ حاصل کر کے بیرون ملک بھی جا چکے ہیں جنہوں نے یورپ اور امریکہ میں قانونی طور یا بطور پناہ گزین شہریت بھی حاصل کر لی ہے جو اَب ان ملکوں کا پاسپورٹ لے کر آسانی سے کشمیر کے دونوں حصوں اور ہندوستان پاکستان میں آتے جاتے ہیں۔

میں نے ذاتی طور پر کئی لوگوں کو تحریک کے ابتدائی دنوں میں پاکستان میں آباد ہونے کا مشورہ دیا تھا اور اکثر لوگوں نے اس پر عمل بھی کیا کہ وہ عام شہری کی زندگی گزارنے کے لیے پاکستان کے بڑے شہروں میں چلے جائیں۔ الحمدللہ اس طرح بے شمار لوگ اتنے آباد ہو گئے ہیں کہ نہ صرف اپنی بلکہ مقبوضہ کشمیر میں اپنے عزیزوں کی کفالت بھی کرتے ہیں۔

کئی لوگوں نے اسلام آباد اور ملک کے مختلف شہروں میں محل نما مکان بھی بنا لیے ہیں اور کروڑوں بلکہ اربوں کی جائیدادیں بھی بنائی ہیں لیکن میری دانست میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے بمشکل اپنی سفید پوشی اور عزت سنبھال کر رکھی ہے۔ حالاں کہ مقبوضہ کشمیر کے اندر ان کی تحریک کے لیے قربانیاں ان گنت اور قابل رشک ہیں۔ ان میں سے ایک محمد فاروق رحمانی بھی ہیں جو کشمیر میں پیپلز لیگ اور الفتح تنظیم کے بانیوں اور علمی ادبی لحاظ سے یکتا تھے۔ ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے؟ کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے! گو کہ خوشامدی ٹولہ نے ان کو وہ مقام نہیں دیا، لیکن انہوں نے اپنے دامن پر کوئی داغ لگنے نہیں دیا۔

مہاجرین اور مجاہدین کشمیر کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے میں حریت کانفرنس کے پاکستان چیپٹر کا بھی بڑا کردار ہے۔ کشمیر میں 1993 میں تیس کے قریب سیاسی اور سماجی جماعتوں کے گروپ نے حریت کانفرنس کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس پلیٹ فارم سے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے الگ الگ مختلف حصے ہو گئے ہیں۔ اس تنظیم کی شاخ بھی پاکستان میں قائم کی گئی ہے جو پاکستان میں کشمیر کی حریت کانفرنس کی نمائندگی کرتی ہے اور یہاں بھی یہ لوگ اسی ترتیب سے ایسے ہی گروہوں میں منقسم ہیں جیسا کہ کشمیر میں لیکن ان کا حکومت پاکستان میں کافی اثر و رسوخ ہے، تاہم ان کی لگام سرکاری ایجنسیوں کے کنٹرول میں ہے۔ ان

کی تنظیم سازی اور مرکزی عہدیداران کی مرضی کے خلاف نہیں بن سکتا۔[341]

جنرل مشرف کے دور میں تو ہر سطح پر مداخلت ہوتی تھی۔ حد یہ تھی سید علی گیلانی جو جنرل صاحب کے فارمولہ کے خلاف تھے، کو عوام کی مرضی کے خلاف تنہا کر دیا گیا تھا، حالاں کہ وہ غیر مبہم طور پر پاکستان کے ساتھ ہیں۔ اس کا مثبت اثر یہ ہو رہا ہے کہ ان کی مدد کے لیے پاکستان کو ایک جواز، اور ان لوگوں کو پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی قربت حاصل ہو گئی ہے لیکن منفی اثر یہ ہے کہ ان کی پالیسیز پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے تابع اور کشمیر کے مقامی حالات اور زمینی حقائق سے بے نیاز ہو گئیں۔ حریت میں شامل جماعتوں کے عسکری گروہ بھی ہیں جن کا کنٹرول متحدہ جہاد کونسل کے پاس ہے۔ حریت کانفرنس کے پاکستان اور ہندوستان دھڑے بھی آزاد کشمیر کی حکومت کی پالیسی اور فیصلہ سازی پر حاوی ہیں جس وجہ سے آزاد کشمیر کی حکومت کی خودمختاری مزید تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔

پاکستان اور بیرون ملک کشمیر کے متنازع اور ہندوستانی فوجوں کی بربریت کو اجاگر کرنے میں ان کا کردار نمایاں ہے کیوں کہ ہندوستانی کشمیر کی حریت کانفرنس کے اکثر لوگوں کو ہندوستان نے پاسپورٹ جاری نہیں کیا ہے۔ حریت کانفرنس میں سے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو میر واعظ عمر فاروق برابر کے طور پر قابل قبول ہیں جبکہ دونوں ملکوں میں احترام سید علی گیلانی کا ہے اور کشمیر کے دونوں حصوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ لیڈر سید علی گیلانی ہیں۔ ان کے پاکستانی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے جبکہ میر واعظ صاحب لچکدار سوچ کے حامل ہیں اور زمینی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے کسی طرف بھی جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے والد مرحوم مولانا فاروق، جنتا دل کانگرس اور نیشنل کانفرنس کے اتحادی بھی رہ چکے ہیں۔ حتیٰ کہ 1987 کے الیکشن میں مولانا MUF (مف) کے برعکس ''ڈبل فاروق'' کے طور کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے اتحادی کے طور پر الیکشن کے دنگل میں تھے لیکن تحریک کے شروع ہونے کے بعد تحریک میں ہندوستان نواز جماعتوں کے خلاف صف آراء ہو گئے اور اب ان کا بیٹا عمر فاروق MUF کے خلاف ہونے کے باوجود اس میں شامل جماعتوں، حریت کانفرنس کے سربراہ ہیں۔ ان کی یہ لچک ہندوستان اور پاکستان دونوں کو پسند ہے۔ اسی لیے جنرل مشرف ان کے

دھڑے کو Moderate کہتا تھا۔ کچھ عرصہ سے یہ خوش آئند بات سامنے آئی ہے کہ حریت کے نمایاں دھڑے، سید علی گیلانی، میرواعظ عمر فاروق اور یاسین ملک ایک پلیٹ فارم سے کام کرتے ہیں۔

حریت کانفرنس کے منشور میں حق خودارادیت کی تعریف میں کشمیر کی خودمختاری بھی ایک حل کے طور شامل ہے اور پاکستان کی حکومت نے اس کو تسلیم کیا ہے جبکہ پاکستان کا سرکاری، آئینی اور قومی موقف سلامتی کونسل کی قراردادوں کے تحت کشمیر کا الحاق صرف ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ہونا ہے۔ سید علی گیلانی صاحب کا موقف صرف سلامتی کونسل کی قراردادوں کی روشنی میں کشمیر کا فیصلہ ہونا ہے اور یہی پاکستان کا موقف بھی چلا آرہا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ سید علی گیلانی جو صرف الحاق پاکستان کی بات کرتے ہیں، کو پاکستان سخت گیر جبکہ لچکدار رویہ والوں کو معتدل کہتا ہے۔ یہ کیسا طرفہ تماشا ہے، مجھے سمجھ نہیں آرہا؟

عسکریت اور کشمیری پنڈتوں کا انخلا

کشمیر میں سیاسی تحریک کے عسکری تحریک میں بدلنے کے ساتھ ہی اس پر مذہبی رنگ چڑھ گیا، یہ تحریک اسلام کے غلبہ کے لیے سمجھی جانے لگی۔ ایسا ہونا فطری عمل تھا کیوں کہ اس تحریک کا مرکز وادیٔ کشمیر تھی جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ عسکری تنظیموں کے نام بھی اسلامی تاریخ اور تہذیب سے ماخوذ تھے، مثلاً حزب المجاہدین، حزب التحریر، البرق، حرکت المجاہدین وغیرہ۔ لیکن یہ تنظیمیں کسی مذہب یا کشمیری پنڈتوں کے خلاف نہیں بلکہ شاکی آبادی کی آواز کا اظہار تھیں جو سب کی سب مسلمان تھے۔ اس کو ہندوستانی فرقہ پرست جماعتوں نے غلط رنگ دے کر، کشمیر کی تاریخ اور تہذیب کا حصہ کشمیری پنڈتوں میں بے سکونی، بداعتمادی اور بدنظمی پیدا کردی۔ ابتدائی دنوں میں کشمیر کے نامور پنڈت ٹیکہ لال، لسہ کول، ٹپلو اور نیل کنٹھ گنجو عسکریت پسندوں کے ہاتھوں مارے گئے جس سے کشمیری پنڈت عدم تحفظ محسوس کرنے لگے۔ اس کے علاوہ بھی چند کشمیری پنڈت مارے گئے جو زیادہ تر ہندوستان کی IB سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مارے گئے ہندو یا پنڈت ہونے کی وجہ سے نہیں۔

341

اس بات کا اعتراف A.S.Dullat جو ہندوستان میں IB اور RAW کا چیف رہ چکا ہے، نے اپنی کتاب Kashmir the Vajpayee years کے صفحہ 61 میں یوں کیا ہے:

"Most of our officers on the ground were Kashmire Pandits, who lived among the ordinary Kashmir folk, and they made for easy targets."

کشمیری پنڈت ڈوگرہ کے زمانے میں ہندو ہونے کے ناتے اس کے قریب اور مسلمانوں کی پسماندگی اور قتل گری کا باعث گردانے جاتے تھے اور ہندوستانی قبضہ کے بعد دہلی اور کشمیر میں اس کی ایجنسیوں کے قریب ترین رہے۔ اسی کے باوجود مسلمان آبادی کے مارے جانے کے مقابلہ میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ ٹپلو تو جتا دل کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے، نیل کنٹھ گنجو مقبول بٹ کو پھانسی کی سزا دینے کی وجہ سے، لسہ کول سرینگر ریڈیو کے ڈائریکٹر کو تحریک مخالف پروگرامز کی وجہ سے مارا گیا۔ جبکہ مولانا فاروق، ڈاکٹر گورو، مبشر الحق وائس چانسلر، ایڈووکیٹ اندرابی، نیشنل کانفرنس کے یوسف حلوائی اور درجنوں ایسے نامور مسلمان بھی مارے گئے۔ عسکری تنظیموں نے بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور انتقام لینے کے لیے طوفان برپا کیا۔ اپنے لیڈروں اور کارکنوں کو بے دریغ تہہ تیغ کیا، تحریک بے لگام ہوگئی۔

ابتدائی دنوں میں ہندوستانی اور ہندوستان نواز لوگوں کے خلاف غم وغصہ کی وجہ سے قتل وغارت ہوئی جس میں مسلمان زیادہ اور ہندو کم تھے۔ اس کی وجہ 1947 سے کشمیریوں کا مینڈیٹ چرایا جانا اور سال 1987 میں اس کی انتہا کرنا تھی۔ کشمیر کی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے اندر کبھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ اِکا دُکا واقعات سماجی یا معاشی رقابتوں کی وجہ سے ضرور ہوئے جیسے پنڈت لڑکیوں کے مسلمان لڑکوں کے ساتھ شادی یا زمینوں کے تنازعوں پر، لیکن اس قسم کے تنازعات مسلمانوں کے آپس میں زیادہ ہوتے رہے ہیں۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا واقعہ 1967 میں ہوا جب پرمیشوری پنڈت لڑکی نے غلام رسول کنٹھ نامی مسلمان سے شادی کی، جس کے خلاف BJP کے کہنے پر کشمیری پنڈتوں نے بھرپور مزاحمت کی لیکن یہ ہندو مسلم فساد کے طور نہیں بلکہ حکومت کشمیر کے خلاف تھے۔ عرب اور سینٹرل

ایشیا سے آ کر کشمیر میں آباد ہونے والے مسلمانوں کے علاوہ کشمیر کی مقامی آبادی کشمیری پنڈتوں کی مسلمان شدہ اولاد سے ہے۔ اور ان میں بھی وہی فضائل، خصائل اور تہذیبی روایات پائی جاتی ہیں جو کشمیر کی قدیمی پنڈت آبادی میں ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے عادات، بیاہ شادی کے رسم و رواج، کھیتی باڑی کے طریقے، رہن سہن کے طریقے ایک جیسے ہیں۔ لہٰذا فساد کی کوئی تہذیبی یا مذہبی وجہ نہیں بنی۔ نومسلم پنڈتوں کے خاندانی نام ویسے ہی چلے آ رہے ہیں، جیسا کہ پنڈت، بٹ، رینہ، کول وغیرہ۔

کشمیر میں پانچویں صدی عیسوی تک بدھ اس کے بعد گیارہویں صدی تک ہندو دَور رہا مسلمان تو اس کے بعد آئے۔ کشمیریوں نے بنیادی طور پر بدھ مت سے ہندومت اختیار کیا اور جب کشمیر میں مسلمان آئے تو ان ہی لوگوں نے اسلام اختیار کیا۔ نہ تو ہندومت تلوار کے زور پر مسلط کیا گیا اور نہ ہی اسلام، ہندو یا بدھ مت الہامی مذاہب نہیں، بلکہ ان کو مذہب بھی نہیں کہا جا سکتا، یہ ایک تہذیب ہے جو صدیوں کی روایات کو اپنا مذہب سمجھتے ہیں اور ان ہی رسم و رواج کے پجاری ہیں۔ جس بھی دوسری تہذیب یا مذہب کی اچھی بات ان کو پسند آئی، وہ اختیار کر لی۔ ہندومت اسی لیے وسعت پذیر ہوا کہ اس میں عقیدے کے طور کوئی سخت قوانین نہیں ہیں جو مذہب کہلائیں جیسا کہ اسلام میں ہے۔ ہندوستان میں اسی لیے رواج کو قانون کی حیثیت حاصل ہے جبکہ اسلام میں جو رواج قرآن یا حدیث کی کسی شق سے تصادم رکھتا ہو، اس کو ماننا یا اس پر عمل کرنا حرام ہے جبکہ ہندومت میں کوئی ایسا قانون قابل قبول نہیں ہوتا جو ان کے صدیوں کے روسم و رواج کے خلاف ہو۔ ہندوستان کے آئین میں گوا صوبہ کے بارے میں باصراحت درج ہے کہ یہاں ان کے مقامی رواج کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے جب کشمیر میں ابتدائی طور پر اسلام صوفیوں اور اولیا کے ذریعہ آیا، اس سے متاثر ہو کر کشمیری ہندو مسلمان ہو گئے۔ اس عرصہ میں کسی کشمیری پنڈت نے اس وجہ سے ترکِ سکونت یا ہجرت نہیں کی کہ ان پر مسلمان بننے کے لیے کوئی زبردستی کی گئی ہو یا تلوار کے زور پر ان کو مسلمان یا ان کی تہذیب کو مٹایا گیا ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بے شمار کشمیری پنڈت علم اور تعلیم دینے یا لینے کے لیے ہندوستان

کے طول و عرض میں پھیلے ہیں۔ ہندوستان میں جن لوگوں کو پنڈت کہا جاتا ہے، وہ دراصل کشمیری ہیں جو علم دینے یا حاصل کرنے کے لیے کشمیر سے باہر گئے۔ کشمیر کی مشہور کتاب راج ترنگنی کا مصنف بھی کشمیری پنڈت ہی تھا۔ کشمیری پنڈت اپنے علم و فضل، ذہانت اور فطانت کے جوہر دکھانے کے لیے ہندوستان میں جاتے رہے۔ پنڈت لعل شنکر نسیم جو کہ کشمیر پنڈت کول تھے، انہوں نے اپنی قابلیت کے باعث داستانِ لکھنؤ کے شعرا میں نمایاں مقام حاصل کیا اور گلزارِ نسیم جیسی بہترین مثنوی لکھ ڈالی۔ کشمیری پنڈت فارسی، سنسکرت اور کچھ لوگ عربی کے بھی ماہر تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے پردادا راج کول جو بعد میں نہرو کہلانے لگا، کو مغل بادشاہ کے کہنے پر فرخ شیر نے دہلی بلایا جو سنسکرت اور فارسی کا ماہر تھا۔ یہ لوگ 1716 میں دہلی گئے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی جاسوسی ایجنسی را کا خالق بھی کشمیری پنڈت آر این کاؤ تھا اور 1971 کے گنگا ہائی جیک کے پس پشت دماغ بھی یہی پنڈت تھا۔ غرض یہ کہ کشمیری پنڈتوں کے لیے ہندوستان کے ہر ادارہ اور تھنک ٹینک کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ آج بھی کشمیری پنڈتوں میں سے کئی کول، بٹ، نہرو، سپرو، ہکسر، پنڈتہ، رینہ، زتشی وغیرہ ہندوستانی دماغ ہیں۔

اس کے برعکس کشمیر میں آباد ہونے والے مسلمانوں نے کشمیری پنڈتوں کی تہذیب کے کئی اطوار اپنائے جو اس وقت بھی وادی کشمیر میں بالخصوص عام ہیں۔ مثلاً مساجد میں ہر روز صبح بہ آواز بلند اورادِ فتحیہ اور درود شریف پڑھنا۔ یہ بھجوں کے متبادل توحیدی کلمات ہیں لیکن بلند و بانگ لہجہ بھجوں والا ہے، جو دنیا میں اور کسی جگہ نہیں ہے۔ پھرن اور دستار پوشاک ہیں۔ بڑے گوشت کا اجتماعی طور نہ کھانا، سلام کے طور آداب عرض کہنا، پرانی کشمیری عورتوں کا سر پر کلا نما اوڑھنی رکھنا، مزارات پر سجدہ کرنا اور چڑھاوے چڑھانا وغیرہ، یہ ملی جلی تہذیب کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس میں ہندو مذہب کو مٹانے کا کون سا عنصر ہے؟

1947 کی شورش، جس کو کشمیر میں قبائلی ریڈ کہا جاتا ہے کے دوران، قبائلی مسلمانوں (جن کو قبائل یا پخ ترئے بھی کہا جاتا تھا) نے بارہمولہ بلکہ پٹن تک رسائی حاصل کر کے جو بدتمیزی، قتل و غارت، اور لوٹ مار کی، اس کا شکار ہندوؤں کے علاوہ ان کو پناہ دینے والے مسلمان بھی ہوئے۔ مجھے اپنے نانا

مرحوم نے ان کے ظلم کی بھیانک داستانیں سنائی ہیں جو کشمیری مسلمانوں پر ہوئیں جنہوں نے کشمیری ہندوؤں کو پناہ دی تھی۔ ان مسلمانوں نے کشمیری پنڈتوں اور سکھوں کو اپنے گھروں میں پناہ بھی دی تھی جس کی پاداش میں بھی مسلمانوں کو ہی قتل وغارت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت بھی کشمیر میں کوئی ہندو مسلم فساد یا غالب کشمیری اکثریت کی اقلیت پنڈتوں کو قتل یا علاقہ بدر کرنے کی کوشش یا شکایت سننے میں نہیں آئی۔ حالاں کہ مہاراجہ کشمیر کی ناک کا بال ہونے کی وجہ سے کشمیری مسلمانوں کو ان کے خلاف جائز شکایات بھی تھیں، جن کی حالت ناگفتہ بہ، ڈھور ڈنگروں جیسی تھی۔ مہاراجہ کے بنگالی وزیر اعظم سر بنر جی ان وجوہات کی بنا پر استعفیٰ دے کر بھاگ گئے کہ ''یہاں کی مسلمان آبادی اَن پڑھ، غریب اور انتہائی بے توقیر اقتصادی حالت میں دیہات کے اندر خصوصی طور پر بہرے جانوروں کی طرح ہانکے جاتے ہیں۔'' اس وقت بھی قتل وغارت جموں کے زیر اثر اور زیر تسلط علاقوں میں ہوئی۔ وہاں پر ان لوگوں کی اپنی تہذیب اور روایات تھیں جو کشمیر وادی سے مختلف تھیں۔ جموں میں ایسی وارداتیں ہوتی رہی ہیں جہاں اقلیت کو جان و مال وعزت سے ہاتھ، دھونا پڑا اور مقامی غالب آبادی نے مقامی مسلمانوں کو تحفظ نہیں دیا جبکہ وادی کشمیر میں اس کے برعکس ہوا۔ میرے خیال میں جموں میں ایسا پنجابی تہذیب کے غلبہ کی وجہ سے ہوا جہاں سکھ حکمرانوں نے ایسی ریت ڈالی تھی اور کشمیر کے مقامی ہندوؤں کو مہاراجہ کی حکومت بچانے کے لیے مہاراجہ نے ایسا کرنے پر اکسایا۔ اور کشمیر کے شہروں میں ایسا منظر تھا کہ

قتل وغارت ہے پالیسی میرے شہروں میں

کشمیر میں سکھوں کی آبادی بھی ہے اور اکثر آبادیاں یکجا ہیں۔ ان کا کشمیر کے ٹرانسپورٹ پر مکمل کنٹرول ہے۔ ان کے باغات اور کاروبار ہیں ان لوگوں نے نہ تو کشمیر چھوڑا اور نہ ہی ان کو کشمیری مسلمانوں سے کوئی شکایت ہے حالاں کہ 1947 میں جموں کے مسلمانوں کی قتل وغارت زیادہ سکھوں نے ہی کی۔ کشمیر میں کسی سکھ کو اس وجہ سے مارنے کی شکایت نہیں ملی کہ یہ سکھ ہے۔ یہ سب لوگ اب بھی وہیں کاروبار کرتے ہیں۔ ہاں کشمیر کے متنازع کردار کی وجہ سے کشمیری پنڈت اور سکھ درست طور پر اس کا ادراک رکھتے ہیں کہ اس مسئلہ کا حل یقینی طور پر کسی وقت ہونا ہے اور وہ حل کشمیری مسلمانوں کی غالب

اکثریت کے حق میں ہی ہوگا خواہ وہ پاکستان کے ساتھ ادغام کی صورت میں ہو (جس کا امکان کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے) یا کشمیر کے ایک خودمختار علاقے کے طور پر۔ ان خدشات کے پیش نظر کشمیری سکھوں نے جموں اور پنجاب میں اپنے ٹھکانے بنا لیے ہیں اور کاروبار بھی شروع کر دیا ہے۔

کشمیری پنڈتوں کا کشمیر سے ترک سکونت یا انخلا مسلمانوں یا عسکریت پسندوں یا مجاہدین یا پاکستان کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ یہ تاریخی عمل کا حصہ ہے۔ ہندو تہذیب سے لگاؤ کی وجہ سے یہ ہمیشہ کشمیر کو چھوڑتے رہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ 1950 کی لینڈ ریفارم اور کشمیر کے غیر یقینی سیاسی مستقبل کی وجہ سے 20% پنڈت ترک سکونت کر کے ہندوستان کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئے ہیں۔ کشمیر میں ڈوگرہ راج کے خاتمہ کے بعد جموں کے ڈوگروں اور کشمیر کے پنڈتوں کا ترجیحی سلوک بند ہونے کے بعد سرکاری ملازمتوں میں مسلم اکثریت کا تناسب بھی بڑھ گیا جس وجہ سے ان لوگوں نے بقیہ ہندوستان کا رخ کر لیا۔ دہلی میں پنڈت نہرو کی حکومت میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا کر کشمیر میں مسلم اکثریت کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے جس کا پہلا شکار شیخ محمد عبداللہ (مرحوم) اور اس کے بعد آج تک یہ سلسلہ تھمنے کو نہیں آتا۔ حتیٰ کہ BJP کے ذریعہ اکثریت کو اقلیت میں بدل کر 2015 میں اس کی حکومت بھی بنوائی۔ یہی لوگ جنہوں نے مہاراجہ کشمیر کے ذریعے اپنے تحفظ کے لیے ریاستی باشندہ کا قانون بنوایا تھا اب ہندوستانی آئین کی دفعہ 370 کو ختم کرانے کے درپہ ہیں جس کے تحت اس قانون کو تحفظ دیا گیا ہے کیوں کہ اب اس کا فائدہ مسلم اکثریت کو مل رہا ہے۔ ہندوستان میں بہتر اقتصادی مفادات اور شادی بیاہ کی وجہ سے بھی ان کا انخلا جاری رہا۔ 1990 کے بعد کا انخلا تو ہندوستان کے پالیسی سازوں کی متعصّبانہ سوچ کا نتیجہ تھا جس کا خاص اور مرکزی کردار اس وقت ریاستی گورنر جگ موہن مانے جاتے ہیں۔ کشمیر سے پنڈتوں کا ہمہ گیر، ایک دم اور منظم انخلاء سرکار کی سرپرستی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ ایک دو ہفتوں کے اندر اندر 35x80 مربع میل وادی کے کونے کھدرے سے فروری 1990 کی خون جما دینے والی سردی میں قطار در قطار قافلوں کی صورت میں لاکھوں کشمیری پنڈتوں کا انخلا یا نقل مکانی، ان نہتے لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی جن کو ٹرکوں، بسوں میں لاد کر فوج کی نگرانی میں بانہال عبور کروایا

گیا۔ کشمیری پنڈتوں کا رجحان بہر حال ہندوستان کی طرف رہا، جیسا کہ مسلمانوں کا پاکستان کی طرف ہے۔ پنڈتوں کا ہندوستان اور مسلمانوں کا پاکستان سے پیار عیاں ہے۔

میرے ادراک کے مطابق حکومت ہند نے اس انخلا کو 1947 کے قبائل ریڈ کے ساتھ دنیا کی نئی حکمت عملی کی روشنی میں جوڑنا چاہا کہ پاکستان کے تربیت یافتہ مسلمان جنگ جوؤں نے ان غیر مسلموں کو اپنے گھر بار، زمین جائیداد سے محروم کرنے کے لیے نکالا ہے، تاکہ دنیا میں ہندوستان یہ ڈھنڈورا پیٹ سکے کہ کشمیری مسلمانوں نے پاکستان کی مدد سے یہ فرقہ وارانہ جنگ چھیڑی ہے، جس کی جدید نام نہاد سیکولر دنیا میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس تحریک کو فرقہ وارانہ تصادم کا نام دے کر حق خودارادیت اور کشمیر کے مسئلہ کے حل سے دنیا کی توجہ ہٹائی جائے جس طرح سال 1971 میں مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے ہندوؤں کے لیے مغربی بنگال کی سرحد کھول کر ان کو ہندوستان میں مختلف مقامات میں آباد کر کے ان کی مظلومیت اور اپنی انسانی دوستی کا ڈھنڈورا پیٹا اور مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں داخل کر کے اس کو بنگلہ دیش بنوایا، اس طرح کشمیر میں سات لاکھ فوجوں کے داخلہ اور مستقل قیام کا ایک جواز بنایا گیا۔ آج وادی کشمیر کا چپہ چپہ فوج کے تسلط اور قبضہ میں ہے۔

اسرائیل اور ہندوستان دنیا کے دو واحد ملک ہیں جنہوں نے فوجی قبضہ کے ذریعہ علاقوں کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہے اور مقامی آبادی میں پتہ بھی ان کی مرضی کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ ہندوستانی فوج نے جگ موہن کی لیڈر شپ میں یہ منصوبہ بنایا تھا کہ کشمیری پنڈتوں کو کشمیر سے نکال کر مسلمانوں کو بلاتفریق قتل وغارت کا شکار کیا جائے جس کے بعد کشمیر پنڈتوں کو واپس وادی میں لایا جائے۔ چوں کہ چال، ڈھال، لباس اور زبان کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے خدشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ بھی مسلمان گمان کرتے ہوئے نہ مارے جائیں۔ مقصد یہ کہ ہندو آبادی کو بچانے اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے ایسا کیا گیا۔ امریکہ میں 9/11 کے بعد ایسا ہی ایک واقعہ ہوا جہاں ایک سکھ کی ڈاڑھی اس کے لیے موت کا پیغام بن گئی اور وہ محض ڈاڑھی کی وجہ سے مسلمان گردانتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔

اب ان لوگوں کو وادی کشمیر کو دو حصوں میں، یا الگ بستیاں بنا کر تقسیم کر کے دوبارہ آباد کاری کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ اس کے ایک حصے میں کشمیری پنڈتوں کو ہندوستانی افواج کے تحفظ کے تحت بسانا چاہتے ہیں۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا اسرائیل میں غزہ کی پٹی میں ہو رہا ہے تاکہ آہستہ آہستہ فوجوں کی مدد سے مسلمانوں کے زیر قبضہ علاقہ میں دخل اندازی کر کے پنڈتوں کی بستی کو توسیع کر کے فرقہ وارانہ فساد برپا کیا جائے۔

لیکن یہ سوچ اور فکر ہندوستان کے سیکولرازم کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے جو ہندوستان بھر میں ایک نئی سوچ کو جنم دے گا کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں اور دیگر اقلیتوں کے لیے الگ الگ بستیاں بسائی جائیں۔ الگ الگ فوج اور پولیس ہو۔ جب کوئی قوم یا ملک تباہ ہونے پر آئے تو ایسی ہی سوچ پروان چڑھنے لگتی ہے۔ نریندر مودی کے برسر اقتدار آنے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کو زبردستی ہندو بنانا اور بستیوں کی Cleansing کرنا ہے۔

اگر ہندوستان کے حکمرانوں کا ادراک صحیح ہوتا تو وادی کشمیر کو ایک مسلمان صوبے کے طور پر ان کی اپنی تہذیب، ثقافت، مذہب کے ساتھ آئینی تحفظ دیتا جیسا کہ آئین کے تحت ''گوا'' کے رسم و رواج کو تحفظ دیا ہے۔ وہاں پر ان کی خصوصی حیثیت میں ہندوستان کو خطرہ نظر نہیں آتا۔ ایسے ہی جموں میں غیر ریاستی باشندوں کو ریاستی حقوق دلانے کی سرگرمیاں ریاست کی Demography کو تبدیل کیے جانے کی کوشش ہے۔ یہ سب کچھ تعصب کا عکاس ہے جس سے کشمیری پنڈت زیادہ غیر محفوظ ہو جائیں گے۔

ہندوستان میں بی جے پی کی حکومت کے کشمیری پنڈتوں کے لیے وادی کے اندر الگ بستیاں بسانے کی کوشش دراصل دو قومی نظریے کی توثیق ہے۔ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کو دیئے جائیں تاکہ مجوزہ بستیوں کے بسانے سے، ہندوستان کے سیکولر جمہوریت کو جو داغ لگے گا اس رسوائی سے بچ جائے۔ کشمیری پنڈت پُرامن طریقے سے کشمیر چھوڑ گئے ہیں اور باقی لوگ جو کشمیر میں موجود ہیں وہ پاکستان میں قومی امانت ہوں

گے جس طرح کافرستان کے لوگ یا صوبہ کے پی کے میں سکھ یا سندھ میں ہندو ہیں۔ ایسی بستیاں فلسطینی قسم کی شورش پیدا کریں گی جن کا مقصد غالباً مسلمانوں کو محصور، مغلوب اور مقید کر کے اپنے ہی وطن میں بے وطن کیا جانا ہے۔

کشمیر کی وادی سیلاب، زلزلہ، قحط، غیر ملکی یلغار کے لیے مشہور ہے ان حالات میں یہاں کی آبادی برصغیر کے دیگر علاقوں میں منتقل ہوتی رہی ہے جس میں ہندو مسلمان سب لوگ شامل ہیں۔ معلوم تاریخ میں ظلم و زبردستی کے تحت صرف کشمیری مسلمانوں نے ہجرت کی ہے جو مغلوں، چکوں اور سکھوں کے ظلم کے زمانے میں ہوا ہے۔ یہ خوبصورتی ہندو تاریخ میں ہے کہ وہ ہر طاقتور چیز کو بھگوان مان کر اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں، خواہ وہ سانپ ہوں یا گائے، ہاتھی ہو یا کوئی طاقتور انسان یا قبیلہ، آگ یا پانی، اس لیے اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ کشمیر کے ہر دور میں کشمیری پنڈت حکومت کا حصہ رہے کیوں کہ حکومت طاقتور ہوتی ہے۔ بعد ڈوگرا کے زمانے میں بھی مسلمان ہی اجڑتے رہے۔ جبکہ کشمیری پنڈت ان کی انتظامیہ کا حصہ رہتے رہے ہیں۔ 1947 میں ان کشمیری مسلمانوں نے ہجرت کی جو پاکستانی سوچ رکھتے تھے یا فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہوئے یا شیخ محمد عبداللہ کے ظلم و ستم یا ہندوستانی فوج کے خوف سے بے بس ہو گئے۔ جموں کے مسلمانوں کی نسبت کشمیر وادی کے مسلمانوں نے نہ ہونے کے برابر اپنا گھر بار چھوڑا جن کی تعداد چند ہزار ہے۔ 1990 کی تحریک کے دوران سرحدی علاقے کے مسلمان لوگوں نے فوج کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر پاکستان ہجرت کی جن کی تعداد قریباً 36 ہزار ہے۔ اسی طرح وادی کے مسلمان لوگوں نے بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں پناہ لی اور اپنا کاروبار دہلی، بنگلور، ممبئی اور کلکتہ وغیرہ میں شروع کیا۔

تحریک کے دوران 1990 میں لاکھوں کشمیری پنڈتوں نے ان کشمیری مسلمانوں کو ہندوستانی اسلحہ سے لیس سرکاری سطح کے قبائل کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی سلامتی کی راہ لی جنہوں نے 1947 میں ان کو پناہ دی تھی۔ یہ شکایت کشمیری مسلمانوں کو اپنے ہم وطن کشمیری پنڈتوں سے بجا طور پر ہے۔ اگر یہ لوگ اس وقت انخلا کی سازش کا حصہ نہ بنتے تو مجھے یقین ہے کہ کشمیر میں اتنی قتل و غارت نہ

ہوتی جتنی ہندوستانی فوج نے اس کے بعد کی۔ اب ان دو قوموں میں بداعتمادی کی ایک خلیج پیدا ہو چکی ہے جو ان کے تعلقات کو اس سطح پر واپس نہیں لا سکتی جس سطح پر 1988 سے پہلے تھے۔ اس خلیج کو کشمیر پر ہندوستانی فوجی قبضہ اور کشمیر میں لوگوں کی مرضی کے خلاف ہندوستانی مداخلت روز بروز اضافہ کر رہی ہے۔

یوں بھی پنڈتوں کی 30 سال سے زائد عمر کی جس نسل نے ترک سکونت کی، وہ اب بڑھاپے میں پہنچ چکی ہے اور ان کی اگلی نسل 30/35 سال کی عمر میں ہندوستانی اور غیر کشمیری رنگ اور تہذیب میں رنگی جا چکی ہے۔ بڑھاپے اور ادھیڑ عمری میں پہنچنے والے لوگ مقامی کشمیری لوگوں کا اعتماد، اپنی شناخت، تہذیب، تمدن کھو چکے ہیں اور ان کو یقیناً یہ روگ کی طرح چاٹتا ہوگا، جبکہ نئی نسل نے نئی تہذیب، نئے امکانات، نیا مستقبل پا لیا ہے ان کی دلچسپی اس کے ساتھ ہو گئی ہے اپنے باپ دادا کی تہذیب کے ساتھ نہیں رہی۔

مجھے 2004 میں دہلی میں آباد ایک کشمیری پنڈت دوست کے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ان کا باپ اپنی شناخت اور تہذیب کھونے کا رونا رو رہا تھا جبکہ بچے ایک وسیع و عریض دنیا میں آباد ہونے پر شاد ماں تھے ان میں سے ایک نے کہا ''انکل ہم آزاد بھی ہو گئے اور آباد بھی'' یہ حقیقت بھی ہے کہ تر دماغ اور چرب زبان کشمیری پنڈتوں کی نئی نسل نے ہندوستان کے شہروں میں آباد ہو کر اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ دنیا ان کے لیے وسیع ہو گئی ہے۔ ہندوستان کی ساری یونیورسٹیاں اور فنی کالجوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ ان کی دلچسپی اپنے معاملات اور معاشیات کے ساتھ ہے تہذیب، کشمیری طور طریقوں سے ان کو نہ تو دلچسپی ہے اور نہ اس کا علم۔ قدرت نے ان سے آبائی شناخت تو چھین لی لیکن ان کے لیے اقتصادی مواقع پیدا کر دیئے جبکہ کشمیری مسلمانوں کو نہ جانے کب تک فوجوں کے ظلم و ستم کی آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ یہ رات ضرور ختم ہو گی لیکن نہ جانے کب؟

کشمیر میں سرکاری ملازمت کرنے والے پنڈت ترک سکونت کے باوجود بھی کشمیر کی

حکومت سے ماہوار تنخواہ لیتے ہیں اور جس جگہ آباد ہوئے وہاں بھی روزگار میں ہیں۔ صرف کشمیری مسلمان ہندوستان میں اجنبی ہو گئے ہیں۔

اب کچھ لوگ واپس بھی آ رہے ہیں اور جو نہیں گئے ان کو اپنے نہ جانے کے فیصلے پر اطمینان بھی ہو رہا ہے۔ جو لوگ کشمیر سے نہیں نکلے ان کو مقامی آبادی نے بھرپور تحفظ دیا۔ میرے ہائی سکول کے ایک استاد پنڈت رتن لعل، بانڈی پورہ میں رہتے تھے جو خود کالج میں لیکچرر اور ان کی بیگم ہائی سکول کی صدر معلمہ تھیں۔ انہوں نے تحریک کا سارا عرصہ اپنے گاؤں میں گزارا۔ میں ان کو ملنے ان کے گھر گیا جنہوں نے اپنی حفاظت پر بھرپور اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ بات ضرور کہی کہ ''ہم لوگ رات کو پاکستانی اور دن کو ہندوستانی دہشت گردوں کے رحم و کرم پر تھے (یعنی رات کو مجاہدین اور دن کو ہندوستانی فوج)۔ انہوں نے کہا کہ جن لوگوں نے کشمیر چھوڑا، انہوں نے اپنی ماں سے غداری کی، لالچ میں آ کر ایسا کیا۔ ہمارے مسلمان ہمسائے ہی ہماری برادری ہیں۔

کشمیری پنڈتوں کے کشمیر سے انخلا کے بعد مرکزی اعلیٰ سول سروسز میں کشمیری مسلمان نمایاں پوزیشنز حاصل کر رہے ہیں گزشتہ کئی برسوں سے IAS،IPS اور باقی سروسز میں کشمیری مسلمان سرفہرست آ رہے ہیں۔ یہ ایک Blessing in Diguise ہے۔

سمندر پار آباد کشمیری باشندے

ریاست جموں و کشمیر کے لوگوں کو بیرونی حملہ آوروں اور حکمرانوں کے دورِ حکومت میں ان کی غلامی اور ملازمت کے ساتھ ساتھ ذاتی وابستگی بھی پیدا ہو گئی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کے لوگ ان ملکوں اور علاقوں میں بھی چلے گئے جہاں سے حکمران آئے تھے۔ ان میں سرفہرست برطانیہ ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے علاقوں میں تو ہر جگہ یہ لوگ آباد ہو گئے ہیں۔ کشمیر میں بیرونی حملہ آوروں اور ان کے حکمرانوں کے ظلم و ستم سے بچنے، قحط، سیلاب، زلزلہ اور وبا کے زمانوں میں بھی بکثرت کشمیری اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسری جگہوں پر آباد ہو گئے۔ اکثر لوگ انگریزوں کے زمانے میں ان

کی فوج، مرکزی محکمہ جات، ریلوے، پوسٹ آفس وغیرہ میں ملازمت کے دوران بیرون ملک چلے گئے۔ میرپور کے مقام پر منگلا ڈیم بننے کی وجہ سے بے گھر ہونے والے لوگوں کے لیے اس وقت کے پاکستانی صدر جنرل محمد ایوب خان مرحوم نے بیرون ملک بالخصوص برطانیہ بھیجنے کا بندوبست کیا جس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ برطانیہ چلے گئے۔ منظم طریقہ سے برطانیہ جانے والے کشمیری لوگ زیادہ تر منگلا ڈیم کے متاثرین ہی ہیں، جنہوں نے وہاں دن رات محنت مزدوری کر کے اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کو بھی وہاں کی خوش حالی میں شریک کر لیا ان لوگوں نے اپنی محنت اور دیانت سے اپنا اقتصادی مستقبل روشن کیا۔ برطانیہ جانے والے کشمیری باشندوں کی پہلی نسل تو اَن پڑھ اور مزدور پیشہ تھی جنہوں نے وہاں محنت کی اور پیسے کمائے، جس سے وہ خود اور ان کی فیملیز بھرپور مستفید ہوئیں۔ البتہ یہ لوگ اپنی نسلوں کو پڑھانے کے سلسلے میں غافل بلکہ غفلت مجرمانہ کے مرتکب ہوئے۔ ان کی دوسری نسل بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر فیکٹریوں میں ملازم، ہوٹل، کاروبار اور ٹیکسی چلاتی ہے۔ لیکن تیسری نسل کما حقہ، مقامی، زندگی میں شامل ہو کر مقامی لوگوں کے ساتھ پڑھنے، لکھنے اور سیاسی زندگی میں شامل ہیں۔ ان میں سے کئی رائج الوقت تعلیم سے منور ہو کر زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا نام روشن کر رہے ہیں۔ اس وقت ایک اندازے کے مطابق پندرہ لاکھ ریاستی باشندے یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں مستقل آباد ہو گئے ہیں۔ جبکہ گلف میں لاکھوں روزگار کی وجہ سے سکونت پذیر ہیں۔ یہ لوگ ہمارے لیے ٹکسال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاکستان کے زرمبادلہ کا 30 فیصد حصہ ان کی طرف سے آتا ہے۔

ان لوگوں کی پہلی اور دوسری نسل کا اپنے آبائی علاقے اور لوگوں کے ساتھ مسلسل رابطہ رہا ہے۔ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ آزاد کشمیر میں اپنے عزیز اقارب کو بھیجتے ہیں اور ان کا بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ اپنے آبائی علاقے کی تعمیر و ترقی اور خوش حالی میں مختلف طریقوں سے بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ یہاں پر زمینیں خریدتے، گھر بناتے اور اپنے عزیز و اقارب کو کاروبار میں لگاتے ہیں۔ بڑے سے بڑے مکان بنا کر اپنی دولت خواہ مخواہ ضائع کرتے ہیں۔ ان مکانوں میں یا تو جانور اور ان کا چارا رکھتے ہیں یا ان کی نگرانی کے لیے چوکیدار مقرر کر کے اس کی فیملی کا خرچہ بھی خود برداشت کرتے ہیں۔

ان کو اگر کبھی واپس اپنے علاقے میں آنا ہو تو وہاں چند دنوں کے لیے رہائش رکھتے ہیں مکان بنانے کی ریت میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں کہ اپنے علاقے میں باقی لوگوں کے مقابلے میں گھر بڑا ہو۔ سارا کیا کرایا فضول اور بے معنی ہو جاتا ہے جبکہ یہ کسی فیکٹری یا دیگر ترقیاتی سکیموں میں لگایا جا سکتا ہے جہاں لوگوں کو روزگار بھی مل سکتا ہے اور ان کی دولت میں بھی اضافہ ہوتا۔

ان لوگوں کی پہلی اور دوسری نسلوں کا چوں کہ اپنے آبائی علاقوں سے تعلق بحال ہے اور ان کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہے، اس لیے یورپ کی سیر کرنے والے اکثر لوگوں کے اخراجات یہی لوگ برداشت کرتے ہیں۔ خود سادہ لوح ہیں، اپنے آبائی علاقے کے سیاست دانوں کے جال میں پھنس کر ان پر اپنی دولت نچھاور کرتے ہیں جو ان کو مختلف حیلوں بہانوں سے لوٹتے ہیں۔ ان کے خلوص اور پیار کو ان کی بے وقوفی اور اپنی ہوشیاری سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کی تیسری نسل کی 90 فیصدی آبادی اس بدعت اور قباحت سے بچی ہوئی ہے۔ ان کی تو اپنے باپ دادا کے علاقوں سے بھی دلچسپی ختم ہو چکی ہے یا ہو رہی ہے اور ان نوسر باز سیاستدانوں کو یہ لوگ گھاس بھی نہیں ڈالتے جو ان کے باپ دادا کو لوٹتے تھے۔ یہ نسل اب یقینی طور اسی ملک کی ہو گئی ہے جہاں یہ رہتی ہے۔ یورپی یونین بننے کے بعد ان لوگوں کی اکثر تعداد یورپ کے دوسرے ملکوں میں آباد ہو رہی ہے جس میں فرانس، جرمنی، سپین، ڈنمارک وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ مکمل طور یورپی ہو گئے ہیں اور اپنے آپ کو وہاں پر غیر ملکی آباد کار نہیں سمجھتے جیسا کہ ان کے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ وہاں کی مقامی زندگی اور بود و باش کا حصہ بن گئے ہیں۔ تاہم ان لوگوں کے سر اس چیز کا سہرا زخود جاتا ہے کہ باپ دادا کی حلال اور حرام کی تمیز کا بھرم قائم رکھا ہے۔ شادی بیاہ بھی کافی حد تک ان رسومات اور طریقوں سے ہوتا ہے جو باپ دادا سے ورثہ میں پائی ہیں۔

ان کے باپ دادا اس نسل سے اس وجہ سے شاکی ہیں کہ ان کو اپنے آبائی علاقوں اور وہاں کے لوگوں سے رغبت یا وہ پیار نہیں جو ان کے باپ دادا رکھتے تھے یا ان سے خواہش رکھتے ہیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ جب ان لوگوں نے ان ملکوں کو اپنا وطن بنایا ہے تو اس وطن کا ہو کر رہنا پڑے گا۔ وہاں کی سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کا حصہ بننا پڑے گا، وگرنہ یہ لوگ وہاں تنہائی

اور تعصب کا بھی شکار ہو جائیں گے۔ میں نے ان ملکوں بالخصوص برطانیہ میں محسوس کیا کہ جو قومی دھارے میں شامل ہو گئے ہیں ان کے ساتھ کسی سطح پر کوئی تعصب یا امتیازی سلوک نہیں ہوتا۔ قومی زندگی میں کردار ادا کرنے کے بھرپور مواقع ملتے ہیں اور ان کے مذہب میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔ ہمارے لوگوں کو وہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرنے چاہییں تاکہ وہ ان لوگوں کو غیر ملکی یا اجنبی نہ سمجھیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے لوگ وہاں بھی اپنی برادری، گاؤں اور گوٹھ کی حد تک محدود ہیں جبکہ یہ دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے سیاست دان ان ملکوں میں جا کر ان لوگوں کی مقامی زندگی میں زہر گھولتے ہیں، جو کہ ملک و ملت کے لیے کسی طور بھی بہتر نہیں۔ انہیں وہاں کی مقامی سیاست اور سماجی زندگی میں شامل کرانے کی بجائے اپنے اپنے علاقوں کی رقابتوں، تعصّبات، برادریوں اور گاؤں گھوٹوں کی سیاست میں بانٹ دیتے ہیں۔ ان کو اس ملک یا علاقے کے لیے فائدہ مند دیکھنے کی بجائے اپنے فائدے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اسی طرح وہاں کی مقامی آبادی کے لیے یہ لوگ اجنبی اور غیر ملکی ہو جاتے ہیں۔

نظر آتے ہیں پجاری تو بہت دولت کے
کوئی الفت کا طلب گار نہیں دیکھا ہے

پاکستان کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے لاکھوں لوگ اس وقت بھی یورپ اور دوسرے ملکوں میں آباد ہیں لیکن وہ لوگ اس طرح مقامی برادریوں اور رنجشوں میں تقسیم نہیں ہوئے ہیں۔ تاہم ہندوستانی لوگوں کے برعکس وہاں ہمارے لوگوں نے آبائی ملکوں کی سیاسی جماعتیں بنالی ہیں اور اس میں تقسیم ہو کر دوسرے کی سیاسی جماعت اور اس کے قائدین کی کردار کشی کرتے ہیں۔ ریاستی باشندے آبائی سیاسی جماعتوں میں تقسیم ہونے کے علاوہ اپنی اپنی برادریوں میں بھی تقسیم ہیں، راجہ، جاٹ، گجر، سدھن، سید جیسی تقسیم نمایاں ہے اور یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے، اس تقسیم میں ان کی صلاحیتیں تلف، دولت ضائع اور ترقی کے مواقع محدود ہو جائیں گے۔ ہمارے سیاستدانوں کو تو ان کی تقسیم سودمند نظر آتی ہے لیکن لوگوں کی توانائیاں ختم ہو رہی ہیں۔ بدقسمتی سے اس وبا میں زیادہ تر میر پور ڈویژن کے لوگ مبتلا

ہیں کیوں کہ وہاں پر ان کی اکثریت ہے اور یہی صاحب ثروت لوگ بھی ہیں۔ اس وبا کا تدارک وہی لوگ کر سکتے ہیں اور جتنا جلدی کر دیں اچھا ہے وگرنہ اپنے آبائی تعصّبات اور سیاست کا وہاں اظہار مستقبل میں وہاں پر ان کی آبادکاری کے لیے حکومتی سطح پر مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ اگر یہ لوگ متحد ہو کر ایک دوسرے کو تسلیم کریں تو مجھے یقین ہے کہ وہاں کی مقامی کونسلوں کی طرح پارلیمنٹ میں بھی ان کی کثیر تعداد ہوگی جن کا حتمی فائدہ ان لوگوں کے وطن مولود اور پاکستان کو ہوگا۔

مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے ان لوگوں کا بڑا کردار ہے جس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر میں چلنے والی تحریک اور وہاں پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو نمایاں کرنے میں ان کا بھرپور کردار ہے۔ ان لوگوں کی مالی، سیاسی، اخلاقی اور سفارتی مدد کرتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ یورپ میں کشمیر کے مسئلہ سے آگاہی ان کی مرہون منت ہے۔ اگر ان کی توانائیوں اور سرگرمیوں کو مثبت طریقے سے استعمال کیا جائے تو خاطر خواہ نتائج مرتب کر سکتے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کے نام پر بھی ان لوگوں کو NGOS بنا کر لوٹا جا رہا ہے۔ یورپی قومیں اپنے ملکی مفادات کی ترویج کے لیے بہروپیوں کی مدد کر کے یا کروا کر پاکستان اور تحریک آزادی کشمیر کو مختلف انداز میں پیش کرواتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی وجہ سے کشمیر اور پاکستان کے حوالہ سے انتشار پھیلایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ اسلام آباد، لاہور یا لندن میں کچھ لوگوں کو ہوٹلوں میں قیام کروا کے کشمیر کے نام پر روزی روٹی کماتے ہیں۔ جس کے ہاتھ جو لگتا ہے، وہ اس جنت نظیر کے بدلے لوٹ رہا ہے۔

آزاد کشمیر کے بارے میں ان کا نظریہ، یہ ہے کہ یہ ایک آزاد ملک ہے اور اس کا وقار اور دبدبہ بھی ویسا ہی دیکھنا چاہتے ہیں، جیسا یورپی ملکوں یا پاکستان کا ہے۔ یہ لوگ کشمیر کی تحریک کو کشمیر کی آزادی اور خودمختاری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے خلاف کچھ کرنا یا سوچنا گناہ سمجھتے ہیں لیکن کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق میں ان لوگوں کی رائے کنفیوژن کا شکار ہے۔ ان لوگوں کو کشمیر کے سیاسی، سفارتی اور آئینی پہلوؤں سے آگاہ نہیں کرایا گیا جس وجہ سے بہت حد تک کنفیوژن کا شکار ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان لوگوں کو کشمیر کے مسئلہ کے بین الاقوامی اور مقامی

حالات سے آشنا کیا جائے۔ ایجنسیوں سے تعلق رکھنے والے ہمارے سیاست دان ان لوگوں کے ذریعہ ہندوستان کے خلاف جلسے جلوس نکلوا کر گالیاں دلوا کر یہ کریڈٹ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کشمیر کاز کو اجاگر کر رہے ہیں حالاں کہ اس سے نہ تو کشمیر کاز کو کوئی فائدہ ملتا ہے اور نہ ہی ہندوستان کا نقصان۔ ان لوگوں کو خدارا جدید تعلیم کی طرف راغب کر کے یورپ اور امریکہ کے پالیسی ساز اور فیصلہ ساز اداروں میں شامل ہونے کی ترغیب دیں، جس کا بلواسطہ فائدہ پاکستان کو ملے گا جس طرح ہندوستان اٹھا رہا ہے۔

ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کے ساتھ ان لوگوں کے تعلقات ویسے نہیں ہیں جیسا کہ ان کے آپس میں ہیں۔ ان کے ساتھ اس طریقے سے میل جول بھی نہیں رکھتے۔ میرے خیال میں سماجی لسانی اور علاقائی وجوہات کی بنا پر یہ لوگ منسلک نہیں ہیں۔ وہاں کے لوگ زیادہ پڑھے لکھے اور پیشہ ور شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ ہمارے پہلی اور دوسری نسل کی اکثریت ان پڑھ اور مزدور پیشہ ہے اسی لیے یہ سماجی اختلاط میں حائل ہے۔ اسی کو پاٹنے کی ضرورت ہے۔ چند ایک لوگ ایسے ہیں جن کے ہر طبقہ سے تعلقات ہیں لیکن یہ محدود اور مختلف تنظیموں کے چلانے والے ہیں۔ ان لوگوں کو نزدیک لانا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اب چوں کہ آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والی تیسری نسل بھی ماشاءاللہ جدید علوم سے بہرہ مند ہو چکی ہے، اس لیے دونوں حصوں کے دانش وروں کا اختلاط کرانا ضروری ہے۔ وہ لوگ وہاں پر اپنے آپ کو انڈین گردانتے ہیں جو قانونی اور بین الاقوامی قانون کے تحت درست ہے جبکہ ہمارے لوگ اپنے آپ کو کشمیری جو نسبت کے لحاظ سے تو درست ہے لیکن بین الاقوامی قانون کے تحت ایسا نہیں ہے۔ ہمارے لوگوں کی وہاں پر قانونی شناخت پاکستانی ہے کیوں کہ پاکستان کی شہریت کے قانون کے تحت ان کو پاکستانی قرار دیا گیا ہے لیکن فی الواقع یہ لوگ وہاں پر شناخت کے بحران کا شکار ہیں۔

مقامی تہذیب سے دور اور اپنی تہذیب سے الگ رہ کر یہ لوگ اپنے آپ کو اپنے آبائی علاقوں میں مقامی اخباروں میں بیانات، خبریں اور تصویریں لگوا کر نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں

جومصنوعی بات ہے۔ پاکستان کی بڑی شخصیات، سیاست دانوں، وزرا، بیوروکریٹس یا آزاد کشمیر کے اسی طرح کے لوگوں کے ساتھ اپنی تصویر لگوا کر اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں۔ حالاں کہ اِن لوگوں کو اُن کے ساتھ تصویر کھنچوا کر اپنے آپ کو بڑا محسوس کرنا چاہیے تھا کہ دیارِ غیر میں ان کا کوئی پرسانِ حال ہے۔ میں نے ایک شخص سے اس بات کا سبب پوچھا تو اس نے بے تکلف انداز میں کہا کہ لوگوں کے ذریعہ وہ اپنے آبائی علاقوں میں اثر ورسوخ حاصل کر کے اپنے عزیز و اقارب اور اپنے مفادات کی نگرانی کرتے ہیں اور ان کے شر سے اپنے اور خاندان کے لوگوں کو بچاتے ہیں۔ شاید اس نے بے ساختہ صحیح بات کہی۔ میں نے خود اپنی سروس کے دوران میر پور اور کوٹلی کے کئی لوگوں کو وہاں کے مقامی سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کے شر اور ان کے خاندانوں اور رشتہ داروں کو جھوٹے مقدمات سے بچایا۔

ان لوگوں کی اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ جب پاکستان آتے ہیں تو ائیر پورٹ سے گھر تک ان کو کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں جھوٹے مقدمے میں پھانسا نہ جائے اور نہ جانے ملک کے اندر ان کے ساتھ کیسا سلوک ہو؟ یہ حقیقت ہے کہ ایئر پورٹ پر ان سادہ لوح لوگوں کو لوٹا جاتا ہے اور انتہائی نامناسب طریقے کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لوگ اپنے ملک میں جا کر سلامتی اور سکون حاصل کرتے ہیں لیکن یہ لوگ ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ نہ جانے اگلی گھڑی کیسی ہو؟ ملک کے اندر لاقانونیت کا پہلا شکار یہ لوگ بنتے ہیں جن کو لوٹنے کے لیے مقامی لوگ اور سرکاری اہلکار طاق میں بیٹھے رہتے ہیں۔

برطانیہ کو پاکستان کا صحن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ پاکستان سے باہر جانے والوں کا پہلا پڑاؤ برطانیہ کا ہی کوئی شہر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست کی بنیاد وہاں پر رکھی جاتی ہے جس کو وہاں کے پاؤنڈ کے زور پر پاکستان میں پھیلایا جاتا ہے۔ ہماری سیاسی جماعتیں ملک پر اثر انداز ہونے والے فیصلے وہاں کرتے ہیں۔ پارٹی کے اجلاس لندن میں ہوتے ہیں اور جماعتیں اتحاد اور اختلاف کی باتیں بھی وہیں کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ ہماری حکومتوں کے اکابرین حکومتی فیصلے بھی وہیں بیٹھ کر کرتے ہیں اور یہ سارا کچھ وہاں کے سادہ لوح لوگوں کی محنت کی کمائی سے ہوتا ہے۔ نہ معلوم کسی میں یہ جرأت کیوں پیدا نہیں ہوتی

کہ ان لوگوں سے پوچھیں یہ سب کچھ وہاں کیوں کیا جاتا ہے اپنے ملک میں کیوں نہیں کرتے؟ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ برطانیہ کی حکومت ان لوگوں کو اپنے ملک میں بیٹھ کر دوست ملکوں کی سیاست میں گند گھولنے کی اجازت کیوں دیتی ہے؟۔ ان سے اس دولت کے بارے میں ضرور کسی دن برطانیہ والے حساب لیں گے جو وہ ان للوں تللوں پر خرچ کرتے ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ اگر ہمارے لوگوں نے وہاں کی نارمل زندگی میں اسی طرح آبائی علاقوں کی سیاست، رقابت، جلسے جلوس کی روش جاری رہی تو برطانیہ کی حکومت قانونی نظام ایسا سخت نہ کر دے کہ وہاں پر مقیم ہمارے لوگوں کی شہریت پر آنچ نہ آجائے۔ 2014 کے اواخر میں آزاد کشمیر کی پاکستان پیپلز پارٹی نے وہاں جو اودھم مچایا وہ یقینا قابل گرفت بن جائے گا۔ اسی طرح ایم کیو ایم کے الطاف حسین لندن میں بیٹھ کر جس طرح پاکستانی سیاست اور پاکستان کے لیے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر رہا ہے یہ بالآخر سب کے لیے پریشانیاں پیدا نہ کر دے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ یورپ اور بالخصوص برطانیہ کے اعلیٰ ترین سیاسی، انتظامی، عدالتی قانونی اور معاشی نظام سے ہمارے سیاست دان اور وہاں پر ہمارے لوگ سبق کیوں نہیں سیکھتے اور ایسا نظام اپنے ملک بالخصوص آزاد کشمیر میں کیوں نہیں چلاتے؟ برطانیہ میں آباد ہمارے لوگوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہمارے حکومتی اور سیاسی اکابرین کی وہاں باز پرس کریں کہ یہ لوگ اپنے ملک کا نظام ٹھیک کیوں نہیں کرتے۔ ایسا کرنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے کیوں کہ وہ لوگ ملک میں آ کر جن تکالیف کا سامنا کرتے ہیں اور ان کے پسماندگان ملک میں جن پریشانیوں کا شکار کیے جاتے ہیں، یہ ان ہی سیاست دانوں کا کیا دھرا ہے جو ان لوگوں کے خرچ پر یورپ اور پاکستان میں عیاشی کرتے ہیں۔ سیاست دان سادہ لوح لوگوں سے اپنے گھر بار کے خرچے اور مکانات بلکہ محل بنانے کے لیے چندہ بھی لیتے ہیں اور اس کے عوض ان کو اپنی جماعت کی جانب سے مختلف عہدوں کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں بسنے والے ریاستی باشندے کسی نہ کسی جماعت کے لیے نامزد عہدے دار ہوتے ہیں اور اس عہدے کا لاحقہ لگا کر اخباروں میں اپنا بیان اور تصویر، بلکہ کسی لیڈر کے ساتھ تصویر لگا کر اپنی بڑائی کا

اظہار کرتے ہیں جس کے عوض اخبار والوں کی بھی خدمت کی جاتی ہے۔ اللہ کرے، ہمارے یہ سادہ لوح لوگ اس خول سے باہر نکل کر حقیقت کی دنیا دیکھیں۔

ان لوگوں کی زبان نئی کروٹ لے رہی ہے جو انگریزی، پہاڑی، اردو، پنجابی کا مرغوبہ بن رہی ہے مثلاً ''ڈوراں شٹ کردے ونڈ آندی ہے۔'' ''دو ویکاں واسطے کنڑی جاساں۔'' ''نہ سلیپڑ اں، نہ ایٹنا بس وینپڑ اہی وی پنڑ اں۔''

میرا ان لوگوں کے لیے پُرخلوص مشورہ ہے کہ یہ ان ملکوں کی سیاسی جماعتوں میں شامل ہو کر مقامی طور پر اپنا سکہ منوائیں۔ یہ اب ان ہی ملکوں کے ہیں وہاں ان کے میرٹ پر آگے بڑھنے کے بہت مواقع ہیں۔ جو لوگ وہاں کی مقامی سیاست میں شامل ہیں انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبر، منسٹر، مختلف کونسلوں کے چیئرمین حتیٰ کے لندن شہر کا میئر بھی اب پاکستانی بنا ہے۔ صدقہ خیرات ضرور اپنے عزیز و اقارب کو بھیجیں لیکن ان کی سیاست وہاں نہ کریں۔

ریاستی باشندگان کی خصوصیات

ریاست جموں وکشمیر کی غالب اکثریت مسلمان ہے۔ صدیوں کی غلامی کی وجہ سے لوگوں کے اندر چاپلوسی اور بغاوت کا جذبہ پروان چڑھا ہے۔ اپنے آپ کو نمایاں بنانے کے لیے علاقائی اور قبیلائی برتری کے ذریعہ اپنی دھونس جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تقسیم کشمیر کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے مختلف حصوں کے لوگوں کی کچھ مخصوص یکسانیت کے علاوہ اکثر عادتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

وادیٔ کشمیر

وادیٔ کشمیر ریاست جموں وکشمیر کا محور ہے اور پوری ریاست کی سیاست وادی کی سرگرمیوں کے پیمانے پر ناپی جاتی ہے جس وجہ سے وادی کشمیر کے لوگ اپنے آپ کو ریاست کے دوسرے حصوں سے منفرد اور یکتا سمجھتے ہیں۔ ریاست کے دیگر علاقوں جموں، لداخ، گلگت بلتستان اور

آزاد کشمیر کے علاقوں کو اپنے مضافاتی اور کانڈی کے علاقے اور لوگوں کو اسی نظر سے دیکھتے بھی ہیں۔ وادی کے حسن و جمال اور اس پر دنیا بھر کے لوگوں کے رشک کرنے سے یہاں کے لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ معتبر اور برتر سمجھتے ہیں۔ گورے چٹے خوبصورت لوگ، کشمیری سیب کی طرح شکل و صورت میں گول مٹول، مہمان نوازی میں یکتا، کھانے پینے کی عادتوں میں عیاش مگر رہن سہن سادہ۔

وادی کشمیر کے اندر غیر کشمیری بولنے والوں کو مجموعی طور پر گجر کہتے ہیں جو کسی پیار یا شناخت کے طور نہیں بلکہ تضحیک اور توہین کے طور پر کہتے ہیں۔ کسی کی عزت کرنا مقصود ہو تو اس کو خان صاحب کہتے ہیں لیکن اگر توہین کرنی مقصود ہو تو ''سست گجر'' کہتے ہیں۔ جموں کے لوگوں کو یہ پنجابی، آزاد کشمیر والوں کو گوجر اور لداخ، گلگت بلتستان والوں کو ''بُٹہ'' کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بلتی سے بگڑ کر بٹہ بن گیا ہو۔ کشمیری بولنے والے ہندو کو غیر کشمیری مسلمان پر ترجیح دیتے تھے۔ آزاد کشمیر کے برعکس وادی میں قبیلوں یا برادریوں کی بنیاد پر کوئی تقسیم نہیں۔ شہری، دیہاتی، زبان یا علاقوں کی بنیاد ضرور ہے۔

کشمیر میں غیر کشمیری بولنے والے گجروں اور پہاڑیوں میں تقسیم ہیں۔ گجروں کو ہندوستانی آئین کے تحت شیڈول ٹرائب ہونے کی وجہ سے غیر معمولی مراعات حاصل ہیں۔ اس وجہ سے ان کی غالب اکثریت ہندوستان کے حق میں سمجھی جاتی ہے۔ خود کشمیری زبان بولنے والے لوگ ایک دوسرے علاقے کے لوگوں کو بھی مختلف القاب دیتے ہیں۔ دیہات میں رہنے والے لوگوں کو گریستو یعنی گنوار کہتے ہیں اور اگر کسی کی عزت کرنی مطلوب ہو تو اس کو خواجہ صاحب کہتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے برعکس وادی میں برادری اور قبیلائی تعصب نہیں لیکن ہندو، مسلمان، کشمیری، پہاڑی اور گوجر تعصب ضرور ہے۔ وادی کے لوگوں بالخصوص سرینگر والوں کے نزدیک مضافات اور ریاست کے دوسرے حصوں کے لوگ دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔ حکومت بنانے اور ہٹانے کی سازش میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ مغلوں کے دورِ حکومت سے لے کر آج تک ہر حکومت میں یہاں کے لوگ حکومت بنانے میں بھی شامل رہے اور ہٹانے میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے رہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جتنے ظلم وستم وادی کشمیر کے لوگوں نے سہے، اتنے اگر یورپ اور امریکہ

کے لوگ سہتے تو نہ صرف مردانگی بلکہ انسانیت بھی کھو بیٹھتے لیکن دھنے ہوان لوگوں کو کہ صبح وشام عزیز و اقارب کی اغیار کی گولیوں سے چھلنی لاشوں کو دفنانے کے باوجود تازہ دم ہوتے ہیں۔ اپنے روزمرہ کے مسائل کے حل کے لیے مین سٹریم جماعتوں کے ساتھ، لیکن بائیکاٹ اور سیاسی اور انتظامی زندگی کو مفلوج کرنے کے لیے تحریک آزادی چلانے والی جماعتوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ فطرت ہے جو غلامی کی ہزاروں سالہ زندگی میں بٹی ہے کہ جان و مال بچانے کے لیے غاصب کے ساتھ لیکن اس سے نجات پانے کے لیے اس کے مخالف کے ساتھ۔ کشمیر کی تاریخ بتاتی ہے کہ مغل، افغان، سکھ، ڈوگرہ اور ہندوستانی کشمیریوں کی ہی دعوت اور ان ہی کی اعانت سے کشمیر پر قابض بھی ہوئے اور ان ہی کی وجہ سے بے دخل بھی۔ فی الوقت ہندوستان وہاں پر مقامی آبادی کی مدد سے ہی غالب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور ہندوستان کو بے دخل کر کے کوئی اور غاصب ان ہی لوگوں کی اعانت اور دعوت پر وہاں غالب ہو جائے گا۔ نہ معلوم میں چین کو ایسا کرتے ہوئے کیوں دیکھ رہا ہوں جو وہاں پر ہانگ کانگ قسم کی ریاست بنا سکتا ہے۔ CPEC کے بننے کے بعد ممکن ہے اس خدشہ کی 20/30 سال کے اندر تکمیل بھی ہو جائے۔ ان لوگوں کی خصلت اور ماضی کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے برصغیر اور عالمی امن کی خاطر ہندوستان اور پاکستان کو مل کر وادیٔ کشمیر کو چناب فارمولہ کی روح کے مطابق حل کر کے اپنے تنازعے ختم کرنے چاہئیں تا کہ ان ملکوں کی سیاست اور اقتصادیات پر دنیا کی کوئی اور طاقت غالب نہ آ جائے۔

جموں

جموں کے لوگ بود و باش میں پنجابی لیکن بول چال میں نیم پنجابی بلکہ پہاڑی لوگ ہیں جو پنجابی کے مماثل ڈوگری بولتے ہیں۔ یہاں اکثریت ہندوؤں کی ہے جبکہ جموں سے منسلک ڈوڈہ، بھدرواہ، کشتواڑ، راجوری اور پونچھ میں مسلم آبادی غالب ہے جو مجموعی طور پر غیر کشمیری بولنے والے ہیں۔ یہ علاقے وادی کشمیر ہی کے مضافات ہیں۔ جموں کے ہندو اور غیر کشمیری بولنے والے مسلمان بھی

کشمیری بولنے والوں کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہیں اور ایک دوسرے کو کشمیری بولنے والوں پر ترجیح دیتے ہیں حالاں کہ ہندو اور مسلمان ہونے کا تعصب بھی اپنی جگہ غالب ہے۔ جموں کے لوگ زیادہ تر ڈوگرہ کہے جاتے ہیں کیوں کہ اودھم پور سے نیچے کھٹوعہ بلکہ ہماچل پردیش کے اکثر علاقے کو ڈوگرہ لینڈ کہا جاتا ہے۔ ڈوگرہ کوئی ہندو ذات نہیں بلکہ اس علاقے میں بسنے والے ہندو اور مسلمان سب ڈوگرہ کہلاتے ہیں۔

ان لوگوں کی شادیاں اور کاروبار ابتدا سے ہی پنجاب کے ساتھ چلا آ رہا ہے، پنجاب میں سکھ حکومت کے دوران جموں کے ڈوگروں کو خاص مقام حاصل تھا اور اسی وجہ سے جموں کی حکومت ان کے ہی پاس تھی۔ کشمیر پر حکمرانی کرنا یہ اپنا حق اور اپنے آپ کو رائل اور کشمیریوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے، جس بنا پر ان کی آپس میں بہت دوری ہے۔ تاہم ڈوگرہ حکومت کے زیر نگیں بندھے رہنے کے باعث رابطہ قائم ہے۔ وادی کے لوگوں یا کشمیری بولنے والوں کو پنجابی ''ہاتو'' کہتے ہیں، جس طرح سعودی عرب میں پاکستانیوں کو رفیق کہتے ہیں۔ یہ لفظ کشمیریوں کے لیے توہین کے طور پر بولا جاتا ہے حالاں کہ اس کے معنی ''اوئے'' یا ''Hello'' کے ہیں جو کشمیری مزدور پنجابی بازاروں میں ایک دوسرے کو بلانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ وادیٔ کشمیر کے لوگوں کی طرح مغلوں، سکھوں، ڈوگروں اور اب ہندوستانی فوج کے ظلم و ستم کا شکار نہیں رہے اس لیے ان میں وادی کشمیر کے لوگوں کی نسبت زیادہ خود اعتمادی ہے اپنے آپ کو ڈوگرہ یا جموں وال کہلوانا پسند کرتے ہیں، کشمیری نہیں۔

جموں کی غالب اکثریت کی خواہش ہے کہ ان کو کشمیر سے الگ صوبہ یا ہماچل پردیش کے ساتھ شامل کیا جائے۔ مظفر آباد، پونچھ اور میر پور ڈویژن کے اکثر سکھ اور ہندو ترک سکونت کر کے جموں میں آباد ہو گئے ہیں جو بہت ہی آسودہ حال ہیں لیکن اپنے وطن مولود کی محبت ان کے دل سے نہیں گئی۔ ان کے کھانے پینے، اوڑھنے، بچھونے اور لباس کی عادات باقی لوگوں سے مختلف ہیں اور پنجاب سے ملتی ہیں۔

لداخ

لداخ دو جغرافیائی اکائیوں پر مشتمل یونٹ ہے جس میں لداخ اور کارگل شامل ہیں۔ لداخ میں بڑی تعداد بدھ جبکہ کارگل میں شیعہ مسلمان ہیں۔ لداخ کی زبان لداخی جبکہ کارگل کی بلتی ہے۔ یہ لوگ وادی سے کٹے ہوئے اور سوچ میں یکسر مختلف ہیں۔ ان کی بھی وادی کشمیر کے لوگوں کے بارے میں یہی رائے ہے جو جموں والوں کی ہے۔ براہِ راست دہلی کی حکومت سے خوش اور لداخ کو یونین ٹریٹری بنانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس علاقے کو ہل کونسل کے نام پر کشمیر کی ریاست کے اندر تقریباً مکمل اقتصادی خودمختاری حاصل ہے جبکہ دہلی سے اس علاقے کی تعمیر و ترقی کے لیے الگ منصوبے منظور کیے جاتے ہیں۔ ''لہہ'' کے لوگ گلگت کے لوگوں کے کافی قریب ہیں لیکن گلگت چوں کہ قدیم الایام سے وسط ایشیا کے ساتھ تجارتی اور سفری سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے اس لیے وہاں کے لوگوں کے برعکس لہہ کے لوگوں کی زیادہ Opening نہیں ہے۔ ہندوستان نے ان لوگوں کو شیڈول ٹرائب کا درجہ دیا ہوا ہے جس وجہ سے یہاں بہت خوش حالی آئی ہے اور ہندوستان میں گوا کے بعد لداخ ہی سیاحتی سرگرمیوں کا مرکز اور محور بن گیا ہے۔ ہندوستانی فوج کی چھاونیاں قائم ہونے کے بعد لداخ کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ چین کے ساتھ ہندوستان کی لداخ کے محاذ پر کشیدگی کی وجہ سے ان لوگوں کے بھاگ جاگ گئے ہیں۔ نوکریاں اور کاروبار عروج پر ہے۔

اس کے برعکس کارگل کا علاقہ پسماندہ ترین ہے۔ اس علاقے کے لوگ شیعہ مسلمان ہیں جو لداخ کی نسبت اپنی قربت بلتستان (سکردو) کے ساتھ زیادہ رکھتے ہیں۔ 1999 کی کارگل جنگ کے بعد یہ علاقہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہاں بھی لہہ کی طرز پر ہل کونسل بنا کر اس علاقے کو اقتصادی طور پر اندرونی خودمختاری حاصل ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں نیشنل کانفرنس اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کی پالیسی بھی یہی ہے کہ ریاست کی مختلف جغرافیائی اکائیوں کو تسلیم کر کے ان کو مقامی اقتصادی خودمختاری دی جائے۔ پاکستان میں شیعہ سنی فسادات اور شیعہ کو غیر محفوظ سمجھنے کے تاثر کی

وجہ سے کشمیر کی غالب شیعہ آبادی کا رجحان ہندوستان کے حق میں سمجھا جاتا ہے۔ انتظامی طور پر لداخ اور کارگل کا علاقہ صوبہ کشمیر کے ساتھ منسلک ہے لیکن مقامی اور اقتصادی طور پر ان کی الگ حیثیت تسلیم کی گئی ہے۔ دونوں علاقوں کے لوگ سادہ اور مصلحت پسند ہیں۔ سرینگر اور جموں میں اپنی شناخت لداخی یا بلتی کے طور پر کرواتے ہیں۔ البتہ لداخی اپنے آپ کو لداخی بودھ کہلواتے ہیں۔ ان علاقوں کا ماضی قریب تک سرینگر کے ساتھ صرف سرینگر لہہ روڈ کے ذریعہ زمینی رابطہ جبکہ لداخ کے ساتھ ہوائی رابطہ بھی تھا لیکن یہ رابطے موسمی حالات کے تابع تھے۔ اب لداخ کو ہماچل پردیش کی طرف سے سڑک نکال کر بھی ملایا گیا ہے لیکن یہ صرف 5/6 ماہ قابل استعمال رہتی ہے، جبکہ کارگل میں بھی ہوائی اڈہ قائم کیا گیا ہے۔ دونوں علاقوں کے لوگ سادہ لوح، اور سخت محنت کش ہیں۔ سردیوں کے موسم میں راستے مسدود ہونے کی وجہ سے گھروں میں ہی مقید رہتے ہیں۔ کچھ لوگ سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی جموں، دہلی، اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں چلے جاتے ہیں۔

آزاد کشمیر

جبری تقسیم ریاست کے بعد آزاد کشمیر کے نام سے ایک نئی جغرافیائی اکائی وجود میں آئی جس میں کچھ حصہ جموں اور کچھ کشمیر کا شامل ہے۔ نام تو اس کا آزاد کشمیر ہے لیکن نہ تو یہ آزاد ہے اور نہ ہی کشمیر۔ عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ یہ فی الواقع آزاد ہے اور صرف ہندوستان کے زیر قبضہ علاقے غلام ہیں۔ اس حد تک یہ بات درست ہے کہ آزاد کشمیر کے لوگ من حیث القوم ہندوستان کے خلاف اور پاکستان کے حق میں ہیں۔ جموں اور کشمیر کے مضافاتی علاقے ہونے کی وجہ سے ان کا اپنا تشخص تاریخی نہیں، البتہ الگ الگ طور خطوں کا تشخص رہا ہے۔ آزاد کشمیر ایک سطحی سی ریاست ہے۔ اس کی کوئی قانونی شناخت نہیں ہے۔ نہ تو پاکستان کے آئین کے تحت یہ پاکستان کا حصہ ہے نہ ہی اس کی انتظامیہ سے آزاد، اور نہ ہی اپنا کوئی تشخص ہے۔ لیکن لوگ بلاشبہ پاکستانی ذہنیت کے ہیں۔ مجموعی طور پر لوگ کشمیر کی آزادی کے نام پر نعرہ بازی کرتے رہتے ہیں۔ کشمیر کے نام پر کشمیر کانفرنسز منانے کا کلچر عام

ہے۔اس نام پر آزاد کشمیر میں حکومتیں بنائی اور ہٹائی جاتی ہیں۔این جی اوز بنا کر کشمیر کے معاملے کا پرچار کیا جاتا ہے لیکن آزاد کشمیر کی اپنی آئینی حالت اور ملک میں اپنی شناخت بیدار کرنے کے حوالہ سے جمود طاری ہے۔اپنا کوئی کلچر پروان نہیں چڑھاتے جبکہ ضلع ہزارہ اور علاقہ پوٹھوہار کا کلچر غالب ہے۔قومی ورثے کے طور پر شالیمار باغ کا بتاتے ہیں اور کلچر نشانیوں کے طور سموار، کانگڑی، پھرل اور تاریخی اعتبار سے وادی کے آس پاس کے واقعات بیان کرتے ہیں۔

سیاسی طور پر لوگ جوں کی توں صورتِ حال بحال رکھنے کے حق میں ہیں۔یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ یہاں کے سیاست دان ہیں جو آزاد کشمیر کے نام پر لوگوں کو بہکانے اور ان کی توجہ مقامی معاملات سے ہٹاتے ہیں۔70 سال کے عرصہ میں پنجاب اور کے پی کے کے ساتھ ملانے والی سڑکوں کی حالت بھی بہتر نہیں کر سکے۔اس تمام مدت میں تعمیر و ترقی اور انتظامیہ کے حوالہ سے صرف جنرل محمد حیات خان نے انقلابی کام کیے جبکہ انتظامی طور سردار سکندر حیات خان نے اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ عام لوگ بہت محنتی، جفاکش، پُرخلوص اور جانثار ہیں جو فی الواقع پورے کشمیر کی آزادی اور خوشحالی چاہتے ہیں۔ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کے ساتھ مذہبی قربت کے علاوہ بہت ساری قدریں مختلف ہیں، مثلاً کھانے پینے کی عادتیں، لباس، زبان وغیرہ۔تین چھوٹے چھوٹے ضلعوں پر مشتمل علاقے کو دس ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ سب کشمیر کے مسئلہ کے نام پر کیا جا رہا ہے جس سے انتظامی اخراجات بے پناہ بڑھ گئے ہیں۔مجموعی طور پر مقامی لوگ برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں۔برادری ایک ہی قبیلے یا نسب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو کہتے ہیں جو اپنا رشتہ تاریخ اسلام کی کسی شخصیت یا کسی حکمران خاندان سے جوڑتے ہیں۔نام کی بجائے قبیلے کے نام سے پکارے جاتے ہیں مثلاً چوہدری صاحب، خواجہ صاحب، سردار صاحب، شاہ صاحب، مغل صاحب، اعوان صاحب وغیرہ۔''جٹاں دا پتر، سیداں دا منڈا، گجراں دا بندہ، راجیاں دے بندے'' کے طور پر میر پور ڈویژن میں تعارف بیان کیا جاتا ہے۔میں اپنے بے تکلف لوگوں سے طنزاً پوچھا کرتا تھا، ''کوئی انسان دا پتر بھی ہے؟'' ملک بھر کی سیاسی جماعتیں یہاں کام کرتی ہیں اور لوگ مختلف قومی جماعتوں میں شامل ہو کر بھی دوسری جماعت کے اندر اپنی برادری

یا قبیلے کے لوگوں کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔پاکستان کے ساتھ کوئی آئینی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے خلا کو قومی سیاسی جماعتوں اور اسٹیبلشمنٹ نے پر کیا ہے جو فی الحقیقت حاکم و محکوم کا تعلق ہے، برابری کا نہیں۔آزاد کشمیر صوبہ کشمیر کے مظفر آباد اور صوبہ جموں کے میر پور، کوٹلی اور پونچھ کے کچھ علاقوں پر مشتمل اکائی ہے۔جغرافیائی طور پر یہ تین خطوں پر مشتمل ہے اور یہی اس کی انتظامی تقسیم بھی ہے جو مظفر آباد، میر پور اور پونچھ ڈویژن ہیں۔تین خطوں کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں اور لوگوں کا میلان طبع بھی مختلف ہے۔

مظفر آباد

مظفر آباد چوں کہ صوبہ کشمیر کا حصہ تھا، اس لیے اس پر وادیٔ کشمیر کی چھاپ ہے۔یہ علاقہ نیلم ویلی اور جہلم ویلی پر پھیلا ہے۔اکثریت نہیں لیکن کشمیری زبان بولنے والے مظفر آباد شہر کے علاوہ گڑھی دوپٹہ، چکار، ہٹیاں، لیپہ وادی، ریشیاں، وادی نیلم کے متعدد حصوں میں آباد ہیں اور اس وقت بھی وادی کشمیر کا کلچر رکھتے ہیں، جو اس وقت مختلف وجوہات کی بنا پر متاثر ہو گیا ہے لیکن آزاد کشمیر کے اندر نام کو تو بہر حال یہی خطہ کشمیری کہلانے کا حق دار ہے، کیوں کہ یہ صوبہ کشمیر کا حصہ ہے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی زمینداریاں ہیں لیکن زیادہ تر لوگ کاروباری اور مزدور پیشہ ہیں۔تقسیم کشمیر سے پہلے مظفر آباد ''شہر'' کے نام سے پکارا جاتا تھا جس طرح وادی کشمیر میں سرینگر کو شہر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔قریبی ضلع ہزارہ کے لوگ اس کو شہر ہی کے نام سے جانتے ہیں۔تقسیم کشمیر کے بعد یہاں کے لوگوں کی زیادہ تر رشتہ داریاں صوبہ سرحد اور پنجاب میں ہیں کیوں کہ یہ نزدیک ترین علاقہ ہیں۔تقسیم کشمیر کے بعد آزاد کشمیر کا دارالحکومت بھی مظفر آباد ہی قرار پایا کیوں کہ آزاد کشمیر کے باقی خطوں کے مقابلے میں یہ سرینگر کے زیادہ قریب تھا۔دارالحکومت ہونے کی وجہ سے یہاں کی مقامی تہذیب آزاد کشمیر کے دوسرے خطوں اور پاکستان کے لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے مخلوط ہو گئی ہے۔یہاں پر ملک کے ہر حصے کا شخص پایا جاتا ہے۔لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی اور پاکستان کے مختلف حصوں میں مزدوری کرتے ہیں۔بیرون

ملک جانے کا رجحان اب بڑھ رہا ہے۔ آزاد کشمیر کے باقی علاقوں کے مقابلے میں یہاں برادری یا علاقہ پرستی نہیں ہے کیوں کہ مخلوط آبادی کی وجہ سے کشادہ کلچر پیدا ہو گیا ہے جو دارالحکومت ہونے کے باعث ہوا ہے۔

وادی کشمیر کے اکثر لوگ ہجرت کے بعد مظفر آباد میں ہی آباد ہوئے اور بعد ازاں ملک کے دوسرے حصوں میں چلے گئے۔ آزاد کشمیر کے پونچھ ڈویژن کے کشمیری بولنے والے لوگ بھی بکثرت مظفر آباد میں آباد ہو گئے ہیں کیوں کہ یہاں ان کے ہم زبان تھے۔ یہ لوگ مقامی کاروبار اور سماجی زندگی میں چھا گئے ہیں جموں سے ہجرت کرنے والے چند گھرانے بھی یہاں آباد ہیں۔ زیریں سطح کی مرکزی ملازمتیں زیادہ مقامی لوگوں کے پاس ہیں کیوں کہ مقامی ہونے کی وجہ سے ان ملازمتوں کی تنخواہ پر صرف مقامی شخص ہی گزارا کر سکتا تھا۔ لوگ کشادہ دل اور اپنانے والے ہیں لیکن خود متحرک نہیں ہیں۔ سید امین شاہ گیلانی کے بعد جو عالم فاضل بھی تھے، سوائے راجہ فاروق حیدر کے ریاستی سطح یا ملکی سطح کا کوئی قد آور لیڈر پیدا نہیں کر سکے لیکن آزاد کشمیر کا سب سے بڑا خطہ ہونے کی وجہ سے آزاد کشمیر کی حکومتیں بنانے میں ان کا بڑا کردار رہا ہے۔ لوگوں کا شروع دن سے ہی بچوں کو پڑھانے کا رجحان رہا ہے جس وجہ سے اچھی ملازمتیں حاصل کی ہیں البتہ کوٹہ سسٹم رائج ہونے کی وجہ سے اس میں عدم توازن پیدا ہو چکا ہے۔ مظفر آباد ضلع اب تقسیم ہو کر تین اضلاع، ہٹیاں، مظفر آباد اور نیلم میں منقسم ہو چکا ہے۔ وادی نیلم، لیپہ اور چکار سیاحت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

میر پور ڈویژن

میر پور ڈویژن میں میر پور، کوٹلی اور بھمبر کے علاقے شامل ہیں جن کی غالب اکثریت پنجابی نما ہندکو بولتی ہے۔ میر پور کی غالب اکثریت برطانیہ میں آباد ہو گئی ہے جو اپنی زبان کو میر پوری کہتے ہیں۔ منگلا ڈیم بننے کے بعد بہت خوش حالی آئی ہے کیوں کہ اکثر لوگ برطانیہ چلے گئے ہیں۔ اربوں روپے کے معاوضے بھی ملے جس وجہ سے لوگ آزاد کشمیر کے دیگر خطوں کے مقابلہ میں زیادہ

آسودہ حال ہیں۔ ان لوگوں نے اسلام آباد میں اپنا وسیع کاروباری نیٹ ورک بنایا ہے اور اربوں کی جائیدادیں بنائی ہیں۔ جموں خطہ سے ہجرت کر کے آنے والے اکثر لوگ میر پور اور کوٹلی میں آباد ہو گئے ہیں اور مقامی آبادی میں رچ بس گئے ہیں۔ لوگ کاروباری ذہن کے ہیں اس لیے ملک کے اندر اکثر جگہوں پر اپنا کاروبار قائم کیا ہے۔ پیسے کی فروانی کی وجہ سے عیاش ہیں۔ محل نما مکان بناتے ہیں جو خالی پڑے ہیں یا ان کو آباد کرنے لیے اپنی گرہ سے خرچ دے کر چوکیدار رکھے ہیں کیوں کہ خود بیرون ملک آباد ہیں۔ مکان بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں بڑی گاڑیوں، اور پلاٹوں کی خرید وفروخت میں فرحت اور ایک دوسرے پر یہ کہہ کر سبقت محسوس کرتے ہیں کہ اس کے پاس کس ماڈل کی کتنے سو سی سی گاڑی اور کتنے پلاٹ ہیں۔ یہاں پر کوئی بھی محفل، پلاٹ، گاڑی یا گھر کے تذکرے کے بغیر نامکمل اور پھیکی سمجھی جاتی ہے۔ لوگ شوشاہ کے بڑے دلدادہ اور شاہ خرچ ہیں۔

پنجاب بالکل ملحق ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی زیادہ رشتہ داریاں پنجاب میں ہوتی ہیں۔ برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں بڑی تعداد جاٹوں اور راجپوتوں کی ہے جن کے بعد گوجر اور سادات ہیں۔ اتحاد اور مجالس قائم کرنے میں برادریوں کے اتحاد کے ذریعہ تنظیمیں بناتے ہیں۔ اپنی شناخت اور دوسرے کا تعارف برادری کے حوالہ سے کرتے ہیں۔ سرکاری ملازمتیں بھلے وہ چھوٹی ہوں یا بڑی، حاصل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ پنجاب کے پوٹھوہار سے منسلک ہونے کی وجہ سے اکثر لوگ فوج میں ملازم ہیں۔ آزاد کشمیر کے سرکاری ملازم آسودہ زندگی گزارنے کے لیے میر پور شہر میں بالخصوص اور میر پور ڈویژن میں کسی بھی جگہ نوکری کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سرکاری ملازموں بالخصوص عدلیہ، انتظامیہ اور پولیس کے ملازموں کی بڑی خدمت خاطر کرتے ہیں۔ اپنے خرچہ پر برطانیہ کی سیر کرواتے ہیں اور تحفہ تحائف سے بھی نوازتے ہیں۔ آزاد کشمیر کی سیاست ان سخی لوگوں کے پونڈوں اور ڈالروں سے مکدر ہو گئی ہے۔ اپنی برادری کے لوگوں کی برتری گنوانے کے لیے تجوریوں کے منہ کھول دیتے ہیں۔ میر پور میں باقی آزاد کشمیر کے مقابلے میں چند صنعتیں بھی لگی ہیں۔ اب تعلیمی میدان میں کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ پرائیویٹ سکولوں اور ہسپتالوں کی بھرمار ہے۔ اس علاقے کو ''چھوٹا لندن''

بھی کہا جاتا ہے۔ عام لوگ سادہ لوح اور پُرخلوص ہیں۔ سرکاری ملازم اور سیاست دان میر پوریوں کی کمائی پر عیاشی کرتے ہیں اور خرچہ کرنے والے لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے فلاں فلاں سے تعلقات ہیں۔ نمایاں سیاسی اور سرکاری شخصیات کے ساتھ تصویر کھنچوانے، ان کو دعوت اور تحفہ تحائف دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اخباروں میں خیر مقدمی بیانات اور تصاویر لگانے کا بڑا رواج ہے۔

2005 کے زلزلے میں اس ڈویژن کے لوگوں نے متاثرین کی دل کھول کر مدد کی جس کے لیے لوگ امریکہ اور یورپ سے بھی امڈ آئے۔ جنہوں نے فوج کے ذریعہ یا خود ایسا کیا، وہ تو جائز جگہوں پر پہنچ گئے، لیکن جنہوں نے درمیانہ داروں کے ذریعہ کیا وہ ضائع ہو گیا، لیکن ان کا خلوص اور ثواب ان کو مل ہی گیا۔

پونچھ ڈویژن، راولاکوٹ، باغ اور سدھنوتی

یہ علاقہ صوبہ جموں کا حصہ تھے، البتہ پونچھ اور باغ کے علاقے جموں کے مہاراجہ کی ذیلی جاگیر تھی اور یہاں کا راجہ بزعم خود اپنے آپ کو الگ سمجھتا تھا۔ حالاں کہ مہاراجہ جموں کا باج گزار تھا۔ غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اب کلیتاً مسلمان ہیں۔ 1947 میں مہاراجہ کشمیر نے یہاں کے راجہ کو برطرف کیا جس کے خلاف پونچھ کے لوگوں میں مہاراجہ کے خلاف نفرت پیدا ہوئی اور مقامی راجہ کے حق میں ہمدردی۔ اسی دوران ہندوستان سے انگریز نکلے اور پورے کشمیر میں مہاراجہ کے خلاف بھی مہم شروع ہو گئی۔ پونچھ کے علاقہ میں مقامی مہاراجہ کو برطرف کرنے کی وجہ سے چوں کہ مہاراجہ جموں کے خلاف پہلے سے ہی مخاصمت موجود تھی، اس نے ایک تحریک کی صورت اختیار کی جس میں پونچھ سے تعلق رکھنے والے ریٹائرڈ برطانوی فوجیوں نے بھرپور کردار ادا کیا اور مہاراجہ کی فوج کو سخت مقابلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ صوبہ سرحد کے قبائل کے جتھوں کے ساتھ مل کر ان لوگوں نے راجوری، مینڈر، نوشہرہ وغیرہ کا علاقہ بھی حاصل کر لیا تھا لیکن ہندوستان کی باقاعدہ فوج آنے کے بعد ان علاقوں کو

ہندوستانی فوج نے چھڑوا لیا۔

پونچھ میں زمینداری محدود ہے۔ لوگ قدیم زمانے کی روایت کو بحال رکھتے ہوئے فوج میں جانے کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے پاکستانی افواج میں آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے پونچھ کے لوگ ہی زیادہ ہیں جو جنرل کے عہدوں تک فائز رہے ہیں اور ہیں بھی۔ شروع سے ہی آزاد کشمیر کی سیاست پر پونچھ کے لوگوں کا غلبہ تھا، اس لیے 80 فیصد تک آزاد کشمیر کی سیاست اور سرکاری ملازمتیں پونچھ کے لوگوں کے پاس ہی رہیں جس وجہ سے معاشرے میں عدم توازن محسوس ہوتا تھا۔ ان علاقوں میں سدھن اور ملد یال قبیلوں کا غلبہ ہے لیکن ان میں اس طرح کی رقابت نہیں جو میر پور میں جاٹوں، راجوں اور گوجروں میں ہے۔ اب اکثر لوگ راولپنڈی میں آباد ہو گئے ہیں اور اپنے کاروبار شروع کیے ہیں۔ فوج اور دوسری اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے ریٹائر ہونے والے لوگ زیادہ تر پونچھ سے باہر ہی آباد ہونے کو ترجیح دیتے ہیں جس وجہ سے ان لوگوں نے اپنے علاقے کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچایا۔ لوگ متحرک اور آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جدت پسندی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ آزاد کشمیر بھر میں صرف یہی خطہ ہے جس میں نظریہ خود مختار کشمیر پروان چڑھ رہا ہے۔۔ میر پور ڈویژن کے بعد سب سے زیادہ اس علاقے کے لوگ بیرون ملک آباد ہیں۔ زیادہ تر مڈل ایسٹ میں محنت مزدوری کرتے ہیں، امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا میں بھی اکثر لوگ آباد ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ ان ملکوں میں جائز ویزے کے ذریعہ کم اور پناہ گزینوں یعنی Asylum Seekers کے طور پر زیادہ آباد ہیں۔ کینیڈا میں تو ان کی اکثریت پناہ گزینوں کی ہے جو قوم پرست پارٹیوں کی وساطت سے گئے ہیں۔ میر پور کے لوگوں کی طرح اپنی دولت ضائع نہیں کرتے بلکہ Productive کاموں میں لگاتے ہیں۔ یہاں کے عام سے عام آدمی کو بھی سیاست کی بڑی ٹھرک ہے۔ دکانوں، سڑکوں، چوراہوں پر سیاست پر بحث وتمحیص ہوتی ہے۔ اخبار بینی ان کا شغل ہے۔ ان کے ساتھ ایک لطیفہ منسوب ہے کہ گھر سے دو انڈے لے جا کر ہوٹل میں اخبار پڑھتے اور انڈے ہوٹل والے کو دے کر کہتے تھے One for tea and one for me یہاں پر مجاہد، غازی، شہید کہلوانے کا عام کلچر ہے۔ لوگ اپنا رشتہ 1947 کے کسی نہ کسی واقعہ سے براہِ راست یا

بالواسطہ جوڑ دیتے ہیں۔ان علاقوں میں کشمیر کے مہاجرین نہ ہونے کے برابر ہیں۔متروکہ املاک زیادہ تر مقامی لوگوں نے الاٹ کروائی ہیں۔متروکہ جائیداد اور خالصہ سرکار اراضی کو الاٹ کروانے کا لوگوں میں آپس میں مقابلہ ہے۔لوگ قواعد وضوابط کے پابند اور متحد ہیں۔بحیثیت حاکم سخت گیر لیکن بحیثیت محکوم یعنی ماتحت وفا شعار اور تابع فرمان، بے باک اور نڈر لوگ ہیں۔

گلگت بلتستان

گلگت بلتستان کے علاقے 1947 تک مہاراجہ کشمیر کے قلمرو میں شامل تھے لیکن کشمیر کی تقسیم کے بعد یہ علاقے ریاست کے آزاد حصوں کی بجائے براہِ راست پاکستان میں شامل ہو گئے جہاں حکومت پاکستان نے اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔1975 تک ان کی ہر لحاظ سے ناگفتہ بہ حالت تھی جس کے بعد بتدریج بہتر ہوتی گئی اور اب آزاد کشمیر سے زیادہ بہتر ہے کیوں کہ ان کی سیاسی سمت واضح ہے۔ان علاقوں میں گلگت تعمیر وترقی کے لحاظ سے آگے اور تجارت وسیاحت کے طور زیادہ جانا پہچانا جاتا ہے۔چین کے ساتھ ملانے والی شاہراہِ ریشم یہیں سے گزرتی ہے جس نے اس علاقہ کو بہت خوش حالی بخشی ہے۔لوگ اپنے آپ کو گلگتی یا بلتی کہلوانا پسند کرتے ہیں اور کسی طور بھی کشمیر کے ساتھ اپنا تعلق یا شناخت جوڑنے کے حق میں نہیں۔پاکستان سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں اور کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر ان علاقوں کو پاکستان کا صوبہ بنانے کے حق میں ہیں۔ان کے آئینی ارتقا میں ایک رکاوٹ آزاد کشمیر کی قیادت ہے جو ہر آئینی اصلاحات کو کشمیر کے مسئلہ سے جوڑ کر فرسٹیٹ کرتی ہے۔گلگت بلتستان کے صدر مقام سے سکردو کا سفر تقریباً 5 گھنٹے کی مسافت پر ہے۔گلگت اور بلتستان سے اسلام آباد براہِ راست ہوائی سروس ہے۔تاہم سکردو میں یہ ہوائی سروس موسم کی خرابی کی وجہ سے اکثر تعطل کا شکار رہتی ہے جبکہ گلگت تک تقریباً روزانہ ہوتی ہے۔نہایت جفاکش اور محنتی لوگ ہیں۔سخت ترین موسمی حالات کا مقابلہ کر کے بھی آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ملک کے باقی حصوں کے مقابلے میں ان لوگوں کی خوراک اور لباس مختلف ہے جو کشمیر کے لداخ اور گریس کے علاقہ سے ملتی ہے۔زیادہ تر لوگ بلتی اور

شینا زبان بولتے ہیں۔اکثر شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں اور ان پر زیادہ اثر شیعہ کے اسماعیلی فرقہ کا ہے۔پرنس کریم آغا خان اسماعیلی فرقہ کے روحانی پیشوا ہیں جنہوں نے ان علاقوں کی تعمیر وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔علاقہ معدنی دولت سے مالا مال ہے لیکن علاقے میں اپنی مقامی مضبوط حکومت نہ ہونے کی وجہ سے مرکزی بیوروکریسی ان علاقوں کی معدنی دولت کو اپنے اللوں تللوں میں بانٹنے میں مصروف ہے۔صوبہ سرحد یعنی کے پی کے کا اس علاقہ میں زیادہ اثر ورسوخ رہا ہے، اس لیے گلگت میں اس صوبے کے اکثر لوگ آباد ہیں اور کاروبار پر قابض ہیں۔

مذہبی جذبات کے حوالہ سے یہ علاقے بہت حساس ہیں۔اکثر شیعہ سنی فسادات ہوتے ہیں۔یہ لوگ خود امن پسند ہیں لیکن غیر مقامی لوگ یہاں فتنہ برپا کرتے ہیں۔ان علاقوں میں شامل چلاس کا علاقہ میرے نقطہ نظر سے مس فٹ ہے جس کی وجہ سے ان علاقوں کی یگانگت بہت متاثر ہوئی ہے۔چلاس کا علاقہ سنی آبادی پر مشتمل ہے جو ان علاقوں کو شیعہ اکثریت سے نکال کر آزاد کشمیر کے سنی اکثریتی علاقے میں شامل کروانا چاہتا ہے۔چلاسی لوگوں کے روپ میں شدت پسند اور تخریب کار اس علاقے سے گزرنے والے معصوم بالخصوص شیعہ لوگوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھاتے ہیں۔جغرافیائی طور پر سکردو کشمیر کے کیل کے علاقے سے اور گلگت استور کے علاقے سے ملحق ہے۔یہ ان لوگوں کی محفوظ گزرگاہیں بن سکتی ہیں لیکن استور کے آگے ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کا علاقہ ہے۔CPEC کے بننے کی وجہ سے یہ علاقے آزاد کشمیر اور پورے ملک سے وابستہ ہو جائیں گے۔

ان علاقوں کو وزیر اعلیٰ اور گورنر کے نام سے منسوب حکومت ملنے سے پورے ملک میں ایک شناخت مل گئی ہے اور بظاہر وہ مقام حاصل ہو گیا ہے جو ملک کے باقی صوبوں کا ہے۔حالاں کہ اندورنی طور یہ علاقے اب بھی حکومت پاکستان کی وزارت کشمیر اور گلگت بلتستان کے زیر نگین ہیں۔مرکزی جماعتوں کی حکومت بننے سے ان علاقوں میں مرکز میں اثر ورسوخ پیدا ہو گیا ہے جس طرح آزاد کشمیر میں مرکزی جماعتوں کی وجہ سے آزاد کشمیر کی ملک بھر میں اوپننگ ہو گئی ہے۔

آزاد کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے میں نے ان علاقوں کے طلبہ کے لیے

یونیورسٹی میں داخلہ اور دیگر مسائل کے حل کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے مختلف وظائف ان لوگوں کو ترجیحی بنیادوں پر دیئے جاتے ہیں۔ گلگت بلتستان پر آزاد کشمیر کے سیاست دان تو اپنا حق جتلاتے ہیں لیکن یہاں کے لوگوں کے لیے تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں باقی یونٹوں کی طرح کوئی کوٹہ مقرر نہیں کیا ہے۔ حکومت پاکستان، آزاد کشمیر کے مقابلے میں ان علاقوں پر زیادہ حق بتاتی ہے اور ان کو کشمیر سے ہر لحاظ میں الگ رکھنا چاہتی ہے، کیوں کہ دفاعی لحاظ سے یہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

341

حصہ دوم

سیاسیات

آزاد کشمیر و گلگت بلتستان

302

آزاد کشمیر میں حکومتوں کی تشکیل و تحلیل

آزاد کشمیر کی حکومت کے قیام کا اعلان بلا کسی مخصوص جغرافیہ اور حکومتی رٹ کے 4 اکتوبر 1947 کو راولپنڈی کے مقام پر غلام نبی گلکار، ایک کشمیری کارکن نے کیا تھا، لیکن اس کے بعد 24 اکتوبر 1947 تک اس کے حوالہ سے کوئی سرگرمی عمل میں نہیں آئی۔ 24 اکتوبر 1947 کو ریاست جموں و کشمیر اسمبلی کے ایک منتخب رکن اور راولاکوٹ سے تعلق رکھنے والے سدھن قبیلے کے بیرسٹر سردار محمد ابراہیم خان مرحوم کو مسلم کانفرنس کی ایمرجینسی کونسل نے آزاد کشمیر کا صدر نامزد کیا اور حکومت کا صدر مقام پونچھ کے پلندری قصبے جو جنجال کے مقام پر مقرر کیا گیا۔ اس وقت تک کوٹلی، مینڈھر، راجوری، نوشہرہ اور مظفر آباد کا مکمل ضلع اسی حکومت کے کنٹرول میں آ گیا تھا۔ حکومت کا نام ''عبوری آزاد حکومت'' اس امید پر رکھا گیا کہ جب پورا کشمیر آزاد ہوگا تو اس وقت اس کی باضابطہ حکومت قائم ہوگی۔

اس کا قیام ابتدائی طور پر ایک آزاد، خود مختار اور سیکولر حکومت کے طور عمل میں آیا تھا۔

24 اکتوبر 1947 کے اعلامیے میں یہ درج تھا، ''کہ یہ غیر فرقہ پرست ریاستی باشندوں کی حکومت ہوگی اور ہمسایہ ممالک ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ برابر کے تعلقات رکھے گی۔'' لیکن جب ہندوستان مسئلہ کشمیر کو سلامتی کونسل میں لے گیا جہاں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے محاذ پر جنگ بندی کروائی گئی تو کشمیر کے دونوں حصوں کو ہندوستان اور پاکستان کے زیر کنٹرول علاقے قرار دیا گیا جس کا حتمی فیصلہ یہاں کے لوگوں کی آزادانہ رائے کے ذریعہ ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کے طور کرنا ہوگا، اس طرح 24 اکتوبر کو قائم ہونے والی حکومت کے خودمختار علاقے، حکومت پاکستان کے زیر انتظام چلے گئے اس کے بعد اس کا نام آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر رکھا گیا، اور اس کا صدر مقام مظفر آباد منتقل کیا گیا۔

آزاد کشمیر میں 1970 تک کوئی باضابطہ آئین نہیں تھا بلکہ وقتاً فوقتاً منسٹری کشمیر افیئرز کی منظوری سے قواعد کار (Rules of Business) کے ذریعہ انتظام وانصرام چلایا جاتا رہا۔ حکومت کی تشکیل بھی 1960 تک کسی ووٹ کے ذریعہ نہیں ہوتی تھی بلکہ آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے نامزد امیدوار کو منسٹری کشمیر افیئرز کی منظوری سے آزاد کشمیر کا صدر تسلیم کرلیا جاتا رہا۔ 1950 میں پہلی بار قواعد کار کا نفاذ کیا گیا جن کو 1952 میں ترمیم کرکے نئے قواعد کار نافذ ہوئے جن کی رُو سے کشمیر افیئرز کے جوائنٹ سیکریٹری کو ایڈوائزر کا رتبہ دے کر آزاد کشمیر حکومت کے معاملات کا نگران مقرر کیا گیا جس کے مشورہ سے ہی آزاد کشمیر کا صدر اپنے اختیارات استعمال کرتا تھا۔ ان قواعد کو بھی 1958 میں ترمیم کرکے جوائنٹ سیکریٹری کے لفظ کو چیف ایڈوائزر میں تبدیل کرکے وہی اختیار اس کے سپرد کردیئے گئے۔ حکومت آزاد کشمیر کو 150 روپے سے زیادہ تنخواہ والی کوئی آسامی تخلیق کرنے کا اختیار نہیں تھا اور نہ ہی ایک سال میں ایک لاکھ سے زیادہ اخراجات کرسکتی تھی۔ منسٹری کشمیر کی اس بالادستی اور اندرون آزاد کشمیر میں لیڈروں کی سازشوں کی وجہ سے آزاد کشمیر میں 1950 سے 1969 تک پانچ صدر تبدیل ہوئے جو بالترتیب سردار محمد ابراہیم خان (اکتوبر 1947 سے مئی 1950)، کرنل ریٹائرڈ علی احمد شاہ (31 مئی 1950 سے یکم دسمبر 1951)، میر واعظ مولانا محمد یوسف (05 دسمبر 1951 سے 21 جون 1952)،

کرنل ریٹائرڈ شیر احمد خان (21 جون 1952 سے 31 مئی 1956) دوبارہ میر واعظ یوسف شاہ (31 مئی 1956 سے 06 ستمبر 1956)، سردار محمد عبدالقیوم خان (7 ستمبر 1956 سے 13 اگست 1957) دوبارہ سردار محمد ابراہیم خان (13 اگست 1957 سے 26 اپریل 1959)، کے ایچ خورشید (1 مئی 1959 سے 5 اگست 1964) خان عبدالحمید خان (7 اگست 1964 سے 7 اکتوبر 1969) تھے۔

جناب کے ایچ خورشید مرحوم کے دورِ حکومت کے دوران آزاد کشمیر حکومت کو کچھ استحکام نصیب ہوا۔ انہوں نے پاکستان میں نافذ بنیادی جمہوریتوں کے قانون کا نفاذ آزاد کشمیر میں بھی کروایا جن کے تحت آزاد کشمیر کے صدر کو ووٹ کے ذریعہ منتخب کیا جانا تھا۔ خورشید صاحب کی حکومت کا بہت بڑا کارنامہ زرعی اصلاحات کا تھا جس کے تحت کاشتکاروں کو حقوق ملکیت دیئے گئے اور جاگیرداری نظام کو ختم کیا گیا۔ کے ایچ خورشید کی قائداعظم کے سیکریٹری اور اس حیثیت میں مرکز میں مضبوط تعلقات کی وجہ سے آزاد کشمیر کے معاملات اور مرکزی بیوروکریسی پر گرفت مضبوط تھی اس وجہ سے اس عرصہ میں آزاد کشمیر کا قد کاٹھ کافی بڑھ گیا لیکن قواعد کار اور قوانین پرانے ہی تھے جن کی وجہ سے مرکز کی آزاد کشمیر میں مداخلت ختم نہیں ہوئی۔ لیکن پس پردہ چلی گئی۔ خورشید صاحب کی معزولی کے بعد 1964 اور 1968 میں ایک توہین آمیز نظام نافذ کیا گیا جس کے خلاف بھرپور مزاحمت ہوئی۔

اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے 5 اگست 1968 کو اس وقت کے آزاد کشمیر کے مضبوط ترین اور قدآور لیڈران (جن کا آج تک کوئی متبادل پیدا نہیں ہوا) سردار محمد ابراہیم خان، سردار محمد عبدالقیوم خان اور کے۔ ایچ خورشید نے ایک مشترکہ علامیہ پر دستخط کرکے مطالبہ کیا کہ آزاد کشمیر میں ایک مضبوط خودمختار حکومت قائم کی جائے جو مہاراجہ کشمیر کی قائم مقام حکومت کے طور کام کرے۔ ویسا تو نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی ہوگا البتہ اس وقت کے ملٹری حکمران جنرل محمد یحییٰ خان نے آزاد کشمیر کی اضطرابی حالت کو کنٹرول کرنے کے لیے آزاد کشمیر حکومت کے صدر خان عبدالحمید خان سے استعفیٰ لے کر آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے پاکستان فوج کے ایک بریگیڈیئر عبدالرحمان خان کو آزاد کشمیر کا صدر مقرر کیا۔ 1970 میں جنرل یحییٰ خان نے آزاد کشمیر کو آئین کا متبادل آزاد جموں وکشمیر گورنمنٹ

ایکٹ 1970 دیا جس کے تحت آزاد کشمیر میں صدارتی نظام حکومت اور اسمبلی کا قیام رائج کیا گیا۔ آزاد کشمیر میں اداروں کی شکل وصورت واضح کی گئی۔ آزاد کشمیر اور حکومت پاکستان کے درمیان اختیارات کا توازن قائم کیا گیا اور آزاد کشمیر کی حکومت کو سوائے خارجہ۔ دفاع اور کرنسی کے باقی تمام اختیارات منتقل کیے گئے۔ یہ پاکستان کے اندر آزاد کشمیر میں 24 اکتوبر 1947 کے بعد سب سے بڑی تبدیلی تھی جب آزاد کشمیر کی حکومت کو اندرونی طور مکمل خودمختاری حاصل ہوگئی۔

اس ایکٹ کے تحت پہلی بار ایک یہ شق رکھی گئی جس کے تحت آزاد کشمیر کے آئینی عہدے کے حامل ہر شخص کو یہ حلف لینا ہوتا ہے کہ ''وہ ملک کا وفادار اور ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا حامی رہے گا''۔ سردار عبدالقیوم خان صاحب نے ایک بار مجھے بتایا کہ یہ شق یحییٰ خان کے ذریعہ انہوں نے رکھوائی تھی اور اسی مجلس میں یحییٰ کو یہ بھی کہا تھا کہ آزاد کشمیر کے صدراتی الیکشن میں حکومت پاکستان کو پاکستان کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان غیر جانبدار نہیں رہنا چاہیے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سوائے سردار عبدالقیوم خان کے آزاد کشمیر میں پاکستان کا حامی کوئی نہیں ہے۔ بقول سردار صاحب مرحوم اس کے بعد پاکستان کی فوج کے ساتھ مربوط رشتہ قائم ہوگیا۔ 1970 میں ہی حکومت پاکستان کے کیبنٹ ڈویژن نے یہ ہدایت بھی جاری کی کہ ''اگرچہ آزاد کشمیر پاکستان کے آئین کے تحت پاکستان کا حصہ نہیں بنا لیکن اس کو ہر معاملے میں پاکستان کے صوبے کی طرح سمجھا جائے۔'' اس سلسلے میں باضابطہ نوٹیفیکیشن مئی 1971 میں جاری کیا گیا اور اس کا اعادہ اکتوبر 1988 کے نوٹیفکیشن کے ذریعہ بھی کیا گیا۔ دونوں نوٹیفکیشن سردار عبدالقیوم صاحب کی صدارت کے دوران ہوئے میرے خیال میں یہ سودے بازی کا حصہ تھا، اس طرح آزاد کشمیر غیر رسمی طور پر پاکستان کا صوبہ سمجھا اور چلایا جاتا ہے۔ گو کہ سردار صاحب مرحوم زبانی طور اس حقیقت کی مخالفت کرتے رہے۔

1970 کے ایکٹ کے تحت صدارتی انتخاب میں سردار محمد عبدالقیوم خان صدر منتخب ہوئے جو 12 نومبر 1970 سے 16 اپریل 1975 تک اس عہدے پر فائز رہے۔ آزاد کشمیر کے صدر رہے۔ ان کے اس عرصہ کے دور حکومت کو آزاد کشمیر کے لوگ بہترین حکومتی دور گردانتے ہیں جب قانون کی حکمرانی اور

انصاف قائم تھا۔ تاہم پیپلز پارٹی کا صدر منتخب ہونے کے بعد حکومت نہ چھوڑنے کی ان کی ہٹ دھرمی کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا جاتا۔ میں اس پر گواہ نہیں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان کو عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعہ برطرف کیا گیا تھا۔ اس الیکشن میں سردار عبدالقیوم خان نے 229512 خورشید صاحب نے 163865 سردار محمد ابراہیم خان نے 114896 اور چوہدری شریف طارق نے 12906 ووٹ حاصل کیے تھے۔

سقوط ڈھاکہ اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ریاست کے دونوں حصوں میں زمینی حقائق اور نفسیات میں تبدیلی آ گئی۔ سقوطِ ڈھاکہ پاکستان کی ملٹری ڈکٹیٹرشپ اور ذوالفقار علی بھٹو کی دانستہ یا نادانستہ اعانت سے وقوع پذیر ہوا کیوں کہ دونوں نے مل کر 1970 کے پاکستانی الیکشن کے نتیجے میں اکثریتی پارٹی کے سربراہ مجیب الرحمان کو حکومت نہیں بنانے دی جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے عوام نے من حیث القوم بغاوت کی۔ ہندوستان نے وہاں فوجیں داخل کیں اور بالآخر 16 دسمبر 1971 کو پاکستانی فوج کا جنرل نیازی ہندوستانی فوج کے کمانڈر جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال کر پاکستانی قوم کی رسوائی کا باعث بنا۔ اس کے بعد مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے مغربی پاکستان میں حکومت بنائی جہاں پاکستان پیپلز پارٹی نے الیکشن میں اکثریت حاصل کی تھی جبکہ اصولی طور پر نئے الیکشن ہونے چاہئیں تھے کیوں کہ مغربی پاکستان کے لوگوں نے متحدہ پاکستان کے حق میں بھٹو مرحوم کو ووٹ دیئے تھے، منقسم پاکستان کے لیے نہیں۔ بہرحال جو نہ ہونا چاہیے تھا، وہ ہوگیا۔ ملک تقسیم ہوکر دولخت ہوگیا، اس کے اثرات آزاد کشمیر پر بھی مرتب ہوئے۔

آزاد کشمیر میں پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے لیڈروں نے یہاں بھی پاکستان کے 1973 میں بننے والے پارلیمانی نظام کی طرز پر آئین اور حکومت کا مطالبہ کیا جس کے پیش نظر گورنمنٹ ایکٹ 1970 کی جگہ آزاد جموں وکشمیر عبوری آئین ایکٹ 1974 نافذ کیا گیا۔ اس کے تحت ایک خودمختار حکومت کو آئینی کالونی بنایا گیا۔ اس ایکٹ کا نفاذ تو حکومت پاکستان نے کیا لیکن اس کی منظوری کی تہمت آزاد کشمیر کی اسمبلی اور سردار عبدالقیوم خان کے سر ہے اور اگر سردار عبدالقیوم خان اس

وقت اس کی منظوری دینے سے انکار کرتے یا اس کے اسمبلی میں پیش ہونے سے پہلے استعفیٰ دے دیتے تو ان کا قد کاٹھ مزید بڑھ جاتا۔ اور آزاد کشمیر اس قدر بے وقار نہ ہوتا جو آج ہے۔ جب لیڈر اقتدار کی خاطر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے سازشیں کرتے ہیں تو اس کی رسوائی قوم کو برداشت کرنا پڑتی ہے۔ یہ ڈراما آزاد کشمیر میں مسلسل چل رہا ہے۔

اس ایکٹ کے تحت آزاد کشمیر کے آئینی معاملات تین حصوں میں تقسیم کیے گئے۔ آزاد کشمیر اسمبلی اور حکومت، آزاد جموں وکشمیر کونسل جس کو بہ یک وقت قانون سازی اور انتظامی اختیارات حاصل ہیں اور حکومت پاکستان جو ان چار معاملات پر کلی اختیار رکھتی ہے جو وفاقی معاملات میں (دفاع، خارجہ، مواصلات، کرنسی) اس کے علاوہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کی نسبت جملہ معاملات اس کے کنٹرول میں ہیں۔ اس کا مطلب ہے آزاد کشمیر کی حکومت یا اسمبلی کو مسئلہ کشمیر سے مکمل طور الگ کیا گیا ہے۔ اعلیٰ عدلیہ میں تقرریاں کشمیر کونسل کی خوشنودی کے تابع کر دی گئیں جو اس سے پہلے آزاد کشمیر حکومت کے اختیار میں تھیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کونسل کی گرفت آزاد کشمیر کی بیوروکریسی پر اس طرح مضبوط کی گئی ہے کہ مرکزی بیوروکریسی کے چیف سیکریٹری، انسپکٹر جنرل، آڈیٹر جنرل، سیکریٹری پلاننگ، سیکریٹری مالیات اور اکاؤنٹنٹ جنرل کو بذریعہ کشمیر کونسل آزاد کشمیر میں تعینات کیا جاتا ہے، جن کی تقرری اور برطرفی پر آزاد کشمیر کی حکومت کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

بہ الفاظ دیگر آزاد کشمیر کی مالی اور انتظامی خودمختاری حکومت پاکستان کے علاوہ کشمیر کونسل کے تحت کر دی گئی ہے جو بالواسطہ حکومت پاکستان ہے اور سارے اختیارات وزیراعظم پاکستان کے پاس بحیثیت چیئرمین کشمیر کونسل ہیں جو خود یا کونسل کے منسٹر اور بیوروکریسی کے ذریعہ استعمال کرتے ہیں آزاد کشمیر کی حکومت نام کی حد تک یقینی طور پر حکومت ہے لیکن کام کی حد تک کچھ نہیں ہے۔ آزاد جموں وکشمیر کونسل کے نام سے یہ ادارہ چھے منتخب ممبران پر مشتمل ہے۔ چھے ممبران کا انتخاب آزاد کشمیر اسمبلی کے ممبران کرتے ہیں جبکہ وزیراعظم پاکستان خود چیئرمین اور اس حیثیت سے پارلیمنٹ کے پانچ ممبران کو کونسل کے ممبر نامزد کرتے ہیں۔ صدر اور وزیراعظم آزاد کشمیر بہ لحاظ عہدہ اس کے ممبر ہیں۔ اس

طرح یہ کونسل بالواسطہ حکومت پاکستان ہے۔ اس کے ممبران کا کام سوائے ترقیاتی فنڈز سے سکیمیں منظور کرانے کے اور کوئی نہیں ہے۔ قانون سازی محض رسمی کارروائی ہوتی ہے۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ باقی بالادستی کے علاوہ حکومت پاکستان کو اس آئین کی دفعہ 56 کے تحت ہمہ گیر برتری حاصل ہے جو ان امور کی نسبت جو دفعہ (3) 31 کے تحت اس کے اختیارات میں ہیں جن کے تحت کسی قسم کا کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتی ہے جو ان تقاضوں اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے حکومت پاکستان ضروری سمجھے۔ اس کو صدر و وزیراعظم کو برطرف کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ میری رائے میں یہ دفعہ حکومتوں کی برطرفی یا ہٹانے کا اختیار نہیں دیتی بلکہ ان معاملات میں قانون سازی اور انتظامی اختیار حکومت پاکستان کو دیتی ہے۔ لیکن آزاد کشمیر کے سیاستدان خود ان کو اس دفعہ کے تحت سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

عبوری ایکٹ 1974 کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''حکومت پاکستان نے یہ ایکٹ سلامتی کونسل کے تحت اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے دیا ہے'' جبکہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کے تحت حکومت پاکستان کی ذمہ داریوں میں صرف مقررہ تعداد سے زیادہ فوجیں اور غیر ریاستی باشندوں کو نکالنا اور آزاد کشمیر میں ''لوکل اتھارٹی قائم کرنا ہے''۔ بہ الفاظ دیگر اس وقت تک یہاں پر سابقہ صورتِ حال بحال رہے گی جو انگریزوں اور مہاراجہ کی حکومت کے دوران تھی۔ سلامتی کونسل کی قراردادوں کے تحت کشمیریوں کو ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنے کا حق ہے لیکن اس ایکٹ کے تحت اس حق کو محدود کر کے الحاق پاکستان سے مشروط کر دیا ہے۔ نہ معلوم وہ کون سی ذمہ داریاں ہیں جن کو پورا کیا گیا ہے؟

آزاد کشمیر کی حکومت اور عدلیہ کے ساتھ تیس سال تجربہ کی روشنی میں میری رائے ہے کہ یہ سہ عملی کسی وقت یقیناً پاکستان کے گلے پڑے گی جو اس کی سلامتی کے لیے بہت بڑا چیلنج ہوگا کیوں کہ آزاد کشمیر کے لوگ حکومت پاکستان کی بالواسطہ غیر ضروری اور ناجائز مداخلت کے خلاف ہیں گو کہ پاکستان کے خلاف قطعاً نہیں ہیں۔ جن معاملات کے بارے میں حکومت پاکستان پالیسی بناتی اور فیصلے

کر کے پورے ملک پر نافذ کرتی ہے (پارلیمنٹ CC1, NFC,NEC,IRA)، ان میں آزاد کشمیر کی نمائندگی، اور باقی سارے معاملات جو پاکستان کے آئین میں اٹھارویں ترمیم اور بیسویں ترمیم کے بعد صوبوں کو دیئے گئے ہیں وہ آزاد کشمیر کے سپرد ہونے سے بداعتمادی اور مخاصمت کی اس خلیج کو پاکستان کے حق میں بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ہی نصاب، یونیورسٹی اور سسٹم کے تحت تعلیم، تربیت اور نوکری حاصل کرنے کے باجود آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے سرکاری عہدے داروں کی Opening نہ ہونے کی وجہ سے پاکستانی اداروں کے مقابلے میں ان کی صلاحتیں محدود اور زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ اپنے سے جونیئر لینٹ آفیسران کے ماتحت کام کر کے ان کی توہین اور تذلیل بھی ہوتی ہے۔ سیاست دان دوسرے ممبران کے خلاف سازشیں کر کے معمولی لوگوں کے تھلے لگے رہتے ہیں۔ اس سب کا نزلہ ریاستی مشینری پر گرتا ہے اور بالواسطہ پاکستان کے ساتھ اس کی وابستگی پر، جس کا ادراک ذی ہوش پاکستانی کو کرنا ہے۔

آزاد کشمیر میں 1974 کے عبوری آئینی ایکٹ کے نفاذ کے بعد یہاں 18 مئی 1975 میں پارلیمانی طرز پر آزاد کشمیر اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے جس کے نتیجے میں تین جماعتی اتحاد، لبریشن لیگ، آزاد مسلم کانفرنس اور پاکستان پیپلز پارٹی آزاد کشمیر نے اکثریت حاصل کی جبکہ سردار عبدالقیوم خان کی مسلم کانفرنس نے بائیکاٹ کیا تھا۔ 42 ممبرز کی اسمبلی میں سے پی پی نے 16 خورشید صاحب کی لبریشن لیگ نے 5 چوہدری نور حسین کی آزاد مسلم کانفرنس نے 3 جبکہ تین تین نشستیں مسلم کانفرنس کے باغی اور آزاد ممبرز نے حاصل کیں۔ اس الیکشن کے نتیجہ میں سردار محمد ابراہیم خان کو آزاد کشمیر اسمبلی اور کونسل کے مشترکہ اجلاس میں 29 مئی 1975 کو صدر منتخب کیا گیا جو 31 اکتوبر 1978 تک فائز رہے جبکہ خان عبدالحمید خان کو 29 جون 1975 کو وزیراعظم منتخب کیا گیا جو 11 اگست 1977 تک وزیراعظم آزاد کشمیر رہے۔

جناب کے ایچ خورشید کی پارٹی لبریشن لیگ نے بعدازاں اپنی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی میں ضم کر دی جو ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ ان کے اس منشور کو عوام میں بڑی پذیرائی ملی

تھی جس کے تحت انہوں نے آزاد کشمیر کی حکومت کو مہاراجہ کشمیر کی نمائندہ حکومت تسلیم کرنے کا نظریہ پیش کیا تھا۔ چوں کہ وہ خود صاف، شفاف اور دیانتدار سیاست دان کے طور جانے پہچانے جاتے تھے، اپنی پارٹی کو پاکستان پیپلز پارٹی میں ضم کرنا پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری غلطی یہ کی کہ پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہونے اور پیپلز پارٹی اور اس کے بانی رہنما ذوالفقار علی بھٹو کے زیر عتاب آنے کے بعد پیپلز پارٹی چھوڑ دی اور دوبارہ اپنی پارٹی لبریشن لیگ کا احیا کر دیا۔ خورشید مرحوم کے اس عمل کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ممکن ہے ان کی کچھ مجبوریاں ہوتیں، لیکن تاریخ لیڈروں کے عمل کو دیکھتی ہے مجبوریوں کو نہیں۔

5 جولائی 1977 کو پاکستان میں جنرل ضیاالحق کے مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد آزاد کشمیر کی حکومت بھی گردش میں آئی گئی۔ جنرل ضیاالحق نے آزاد کشمیر اسمبلی اور کونسل کے ذریعہ آئین میں ترامیم کروا کے 11 اگست 1977 کو ایک صدارتی حکم جاری کروا کر آزاد کشمیر اسمبلی کو برطرف کر کے نئے انتخابات اکتوبر 1977 کو منعقد کرنے کا اعلان کیا جبکہ 8 اکتوبر 1977 کو ایک اور حکم کے ذریعہ آزاد کشمیر میں الیکشن پاکستان کے الیکشنز کے دس دن کے اندر منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے تسلسل میں کاغذات نامزدگی وغیرہ بھی جمع کرا دیئے گئے تھے لیکن پاکستان میں احتساب کا ہوا کھڑا کر کے الیکشن التوا میں پڑ گئے اور دس دن کا مفروضہ ویسا ہی رہا۔ ضیاالحق نے سردار محمد ابراہیم خان سے دفعہ A-53 کے تحت بھرپور کام لے کر ان کو بھی 31 اکتوبر 1978 کو چیئرمین کشمیر کونسل کی حیثیت سے برطرف کر کے اسی دن حاضر سروس بریگیڈئر محمد حیات خان کو آزاد کشمیر کا منتظم اعلیٰ اور صدر مقرر کر دیا جو اس عہدہ پر فروری 1983 تک فائز رہے اس کے بعد دوبارہ فوج میں واپس لیا گیا جہاں سے وہ میجر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

حقیقی معنوں میں آزاد کشمیر کے اندر تعمیر و ترقی کا سہرا جنرل حیات خان کے سر ہے جنہوں نے آزاد کشمیر کے لوگوں کی بھرپور خدمت کی بجلی، پانی، سڑکیں، ٹیلیفون گھر گھر پہنچائے۔ لیکن ساتھ ہی آزاد کشمیر کے سیاست دانوں کو احتساب کے شکنجے میں اتنا کسا کہ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ایک طرف ان کی

تعمیر وترقی کے خوف اور دوسری طرف سیاست دانوں کے احتساب نے سیاست دانوں کو ان کے خلاف اکٹھا کر دیا جنہوں نے جنرل حیات خان کا حکومت کرنا ناممکن بنا دیا۔ جنرل ضیاالحق نے بے بس ہو کر ان کی جگہ دوبارہ جنرل عبدالرحمن کو یکم فروری 1983 کو آزاد کشمیر کا صدر اور منتظم اعلیٰ مقرر کر دیا جو اس عہدہ پر یکم اکتوبر 1985 تک فائز رہے جب آزاد کشمیر اسمبلی کے الیکشن 15 مئی 1985 کو منعقد ہوئے۔ یہ الیکشن بھی اسی اصول کے تابع پاکستان میں فروری 1985 کے غیر جماعتی بنیاد پر الیکشن کے بعد ہوئے۔

الیکشن 1985

میں نے 1982 میں مسلم کانفرنس میں شمولیت اختیار کر لی تھی جس کی وجہ سے 1985 کے الیکشن میں، میں نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ مجھے مسلم کانفرنس کے چیف الیکشن ایجنٹ کی ذمہ داری دی گئی۔ نیلم آٹھ مقام کے حلقہ سے پیپلز پارٹی کے امیدوار میاں غلام رسول کے کامیاب ہونے کے اعلان نے مسلم کانفرنس کی صفوں میں کافی اضطراب پیدا کر دیا کیوں کہ وہاں سے مسلم کانفرنس کے امیدوار سردار گل خنداں کی پوزیشن زیادہ مضبوط تھی جس کو مقامی انتظامیہ کی ملی بھگت سے ہرایا گیا تھا۔ چنانچہ سردار عبدالقیوم خان نے مجھے ہدایت کی کہ میں نیلم ریٹرننگ آفیسر کے پاس جا کر ووٹوں کی دوبارہ گنتی کرواؤں۔ میں راجہ محمد حنیف خان اور حاجی محمد اشرف ایڈووکیٹ کے ہمراہ وہاں گیا۔ یہ بڑا جان لیوا سفر تھا کیوں کہ نیلم کو ملانے والا واحد نوسیری پل گر گیا تھا جس کی جگہ رسوں پر چلنے والی ایک ڈولی لگائی گئی تھی جس پر جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم نے دریا پار کیا۔ نیلم میں نعیم شیراز اے سی/ایس، ڈی ایم، ریٹرننگ آفیسر تھے جس نے بہت بحث وتکرار کے بعد دوبارہ گنتی کا حکم دیا۔ گنتی کے دوران میاں غلام رسول کی جانب سے شیخ عبدالعزیز مرحوم ایڈووکیٹ شامل تھے۔ ہم لوگوں نے وکالت کے پیشہ وارانہ اصولوں کے تحت معاملہ یکسو کیا، بالآخر طے پایا گیا کہ گل خنداں کے کئی جائز ووٹ ناجائز طریقے سے مسترد کیے گئے تھے اور ایک پولنگ اسٹیشن پر 27 یا 72 جعلی ووٹرلسٹ بنا کر میاں صاحب کو یہ ووٹ ڈالے گئے تھے۔ جب اس کا راز فاش ہوا تو پتہ چلا کہ اے سی کے ایک کلرک جو گنتی میں شامل تھا، نے ایسا کیا ہے۔

اس نے یہ ووٹرلسٹ تو نگل لی لیکن وہ ووٹ مسترد ہو گئے۔ یہ کلرک بعد ازاں اس وجہ سے وفات بھی پا گیا۔ بہرحال سردار گل خنداں کو کامیاب قرار دیا گیا۔

حیرانی کی بات ہے کہ جنرل حیات خان جس نے آزاد کشمیر میں بے لوث اور قابل رشک کام کیے تھے کو اپنے علاقے اور برادری سے باہر کوئی سیٹ نہ مل سکی جس نے 1985 الیکشن میں تحریک عمل پارٹی کے تحت الیکشن لڑا تھا۔ یہ ہماری قوم کا بہت بڑا المیہ ہے کہ کسی کی کارکردگی کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی مفاد کی بنا پر ووٹ دیئے جاتے ہیں۔ لوگ چڑھتے سورج کے پجاری ہیں۔ ہوس ہمارے لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ پونچھ میں بالخصوص سدھن قبیلے کے لوگوں نے سردار محمد ابراہیم خان مرحوم کی بجائے جنرل حیات خان کو متبادل قیادت کے طور پیش کیا تھا لیکن یہ ممکن نہیں ہوا۔ حکومت سازی کے مرحلہ پر سردار عبدالقیوم خان صاحب نے میری ذمہ داری لگائی کہ میں عبدالطیف سلہریا جو صوبہ سرحد سے مہاجرین کی نشست پر آزاد امیدوار کے طور منتخب ہوئے تھے، کو مسلم کانفرنس کی حکومت بنانے میں مدد کرنے اور جماعت میں شامل ہونے کا کہوں۔ اس وقت کاغان کے سید محمد قاسم شاہ وزارتِ امورِ کشمیر کے انچارج وزیر تھے جن کے ساتھ میرے مراسم بہت گہرے تھے۔ ان کی وساطت سے سلہریا صاحب مسلم کانفرنس میں شامل ہوئے جس وجہ سے 1985 میں مسلم کانفرنس کی حکومت ممکن ہوئی۔ اس الیکشن میں مسلم کانفرنس نے 19 تحریک عمل نے 8 لبریشن لیگ نے 4 آزاد کشمیر مسلم کانفرنس نے 2 باقی آزاد امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔

مرکز میں چوں کہ ضیاالحق کی حکومت تھی اور سردار عبدالقیوم خان صاحب کے ساتھ ان کا گٹھ جوڑ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مقامی حکومت کے صدر جنرل عبدالرحمن کا مسلم کانفرنس کے لیے نرم گوشہ تھا جن کو یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ ان کو صدر منتخب کیا جائے گا۔ مرکزی حکومت کے نرم گوشہ کی وجہ سے مرکزی ایجنسیوں نے مسلم کانفرنس کے حق میں فضا بنائی تھی۔ سردار عبدالقیوم خان اور ان کی جماعت مظلوم کے طور بھی پیش ہوئے جن کو پہلے بھٹو صاحب کے دور اور پھر مارشل لاء کے دور میں جنرل حیات خان نے خوب زیر عتاب رکھا تھا۔ ان کا 1970 کی حکومت کے حوالہ سے تاثر بھی اچھا تھا۔ ان

وجوہات کی بنا پر مسلم کانفرنس کو پذیرائی ملی۔ پیپلز پارٹی نے بائیکاٹ کیا تھا یہ مسلم کانفرنس کے حق میں ایک اور فیکٹر تھا۔

16 جون 1985 کو آزاد کشمیر اسمبلی نے سردار سکندر حیات خان کو وزیر اعظم منتخب کیا۔ سردار صاحب کی خواہش تو تھی کہ وہ وزیر اعظم بنیں لیکن سکندر حیات خان نے کچھ ایسا گٹھ جوڑ بنایا کہ مرکز کا جھکاؤ بھی ان کی طرف ہو گیا۔ جبکہ سردار عبدالقیوم خان صاحب کو مشترکہ اجلاس میں 30 ستمبر 1985 کو صدر منتخب کیا گیا۔ سردار سکندر حیات کا کہنا ہے کہ جنرل ضیاالحق سردار عبدالقیوم خان کو صدر بنانے پر بھی راضی نہیں تھے لیکن ان کی گارنٹی سے ایسا ہوا۔ لیکن ایسا لگتا نہیں کیوں کہ سردار عبدالقیوم خان کا پاکستان فوج کے ساتھ ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا ہے اور جنرل ضیاالحق کے ساتھ بالخصوص تھا۔

سردار صاحب پاکستان کی حکومت بلکہ فوج کو یہ باور کرانے میں ہمیشہ کامیاب رہے کہ وہ اور ان کی جماعت آزاد کشمیر میں دفاعی یونٹ کے طور کام کر رہی ہے۔ باقی سب لوگ پاکستان مخالف ہیں۔ ان کا فلسفہ آزاد کشمیر کو پاکستان کا دفاعی حصار اور دفاعی یونٹ ہونا اور ان کا بیٹا سردار عتیق خان کا ملٹری ڈیموکریسی کا پرچارک ہونا ہے۔

سردار سکندر صاحب نے اپنی وزارت عظمیٰ کو تحفظ دینے کے لیے آزاد کشمیر میں چند ایسی ترامیم کروائیں جو ان کی حکومت کے زوال کا باعث بن گئی تھیں لیکن ان میں سے ایک کو واپس لینے کے بعد وہ بچ گئے۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ جن اراکین اسمبلی نے وزیر اعظم کو ووٹ دیا ہے یا جو آزاد امیدوار کے طور ممبر منتخب ہو کر کسی جماعت میں شامل ہوئے ہیں، ان کا ووٹ وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ دوسری ترمیم کے ذریعے خواتین کی 5 اور تین دوسری نوعیت کی نشستوں کا اسمبلی میں اضافہ کیا گیا۔ دیگر تین میں سے ایک عالم دین، دوسری ٹیکنو کریٹ اور تیسری سمندر پار کشمیریوں کی نشست تھی۔ اس طرح انہوں نے اپنی پوزیشن مضبوط کر لی لیکن آزاد کشمیر کے لوگوں کے حق حکمرانی کو ان غیر نمائندہ لوگوں کا محصور بنا دیا۔ اس طرح آزاد کشمیر کے لوگ بارہ مہاجرین نشستوں اور ان آٹھ نشستوں کے یرغمال بن گئے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی جمہوری طرز حکومت میں عوامی

نمائندگی کے اداروں میں اس طرح کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ سینٹ یا ایوان بالا میں تو ایسا ہوتا ہے لیکن براہ راست نمائندگی کے اداروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اب یہ ساری سیٹیں سرکاری پارٹی یا حکومت پاکستان کی ہیں۔ آزاد کشمیر کے لوگوں کی نہیں۔ مہاجرین چوں کہ پاکستانی صوبوں میں آباد ہیں اس لیے ان ممبران کی متعلقہ صوبائی یا مرکزی حکومتی پارٹی یا حکومت کے دباؤ میں لا کر آزاد کشمیر حکومت کو غیر مستحکم کیا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر میں تحریک عدم اعتماد کے محرک عموماً یہی ممبر بنتے ہیں۔ اگر ایسا کرنا کسی طور پر ناگزیر ہے تو ان میں توازن پیدا کرنے کے لیے آزاد کشمیر میں مقیم کشمیری مہاجرین کو بھی ان میں شامل کر کے متناسب نمائندگی کا اصول بنایا جائے۔

سکندر صاحب نے عوامی نمائندگی کے ایکٹ میں ایک اور ترمیم بھی کرائی جس کے ذریعہ ایک سیاسی جماعت کا مجموعی ووٹوں کے 12.5 فیصد اور ضلع سے 005 فیصد حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ اس سے کم ووٹ ہونے کی صورت میں اس جماعت کی رجسٹریشن منسوخ اور منتخب شدہ ممبران کو فارغ تصور کیا جائے گا۔ اس کی زد میں جنرل حیات خان کی تحریک عمل پارٹی، آزاد مسلم کانفرنس اور مسلم کانفرنس غازی آ رہی تھیں جن کے کم و بیش 16,17 ممبران کی ممبر شپ ختم ہونے کے علاوہ ان کی جماعتوں کی رجسٹریشن ختم ہو جانی تھی۔ اس قانون کو آزاد کشمیر ہائی کورٹ نے کالعدم قرار دے کر غیر جمہوری اور غیر ضروری شق ختم کر دی۔ عوامی تحریک کے دباؤ اور مرکزی حکومت کے دباؤ کے تحت سکندر صاحب کو آئین کی وہ ترمیم واپس لینی پڑی جس کے تحت عدم اعتماد کے ووٹ پر پابندی لگائی گئی تھی جبکہ آزاد کشمیر ہائی کورٹ نے عوامی نمائندگی کے ایکٹ میں ترمیم کالعدم قرار دی۔ مرکزی وزیر سید قائم علی شاہ کے گھر اس سلسلے میں ایک میٹنگ میں اس وقت کے وزیر قانون اقبال احمد خان بھی تھے کشیدہ ماحول اس وقت خوشگوار ہو گیا جب ٹی وی پر موسم کے حالات میں آزاد کشمیر کا درجہ حرارت اسلام آباد سے زیادہ دکھایا گیا۔ اقبال احمد خان نے کہا کہ کشمیر کا موسم اتنا گرم ہوتا ہے؟ اس پر میں نے کہا کہ موسمیات کونسل سبجیکٹ ہے اس لیے زیادہ گرم ہے۔ اس پر سب ہنس پڑے۔

ان تمام تر غیر جمہوری اقدامات کے باوجود سردار سکندر کی حکومت کی انتظامیہ پر گرفت

مضبوط ترین، اور قواعد وضوابطہ پر سختی سے عمل ہوتا رہا۔ میں نے اپنی آزاد کشمیر میں موجودگی کے دوران قواعد وضوابطہ پر سختی سے پابندی کرنے والی جنرل حیات، جنرل عبدالرحمن اور سردار سکندر حیات خان کی پہلی حکومت ہی دیکھیں۔ باقی تمام بدامنی اور افراتفری کا شکار رہیں۔ قاعدے قانون کو حکمران اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے تھے۔ سردار سکندر صاحب پر بدعنوانی اور برادری ازم کے بہت الزامات لگے۔ ان کے حوالے سے تفصیل ان کے احوال میں موجود ہے۔

سکندر صاحب کی حکومت، سردار عبدالقیوم خان اور مسلم کانفرنس کو مجموعی طور پر سال 1988 میں جنرل ضیاالحق کے ہوائی حادثے میں ہلاک ہونے کی وجہ سے دھچکا لگا اور ان کی مرکزی سرپرستی ڈانواں ڈول ہوئی۔ مرکز میں پیپلز پارٹی مضبوط ہونے لگی اور 1988 میں مرکز میں الیکشن کے بعد محترمہ بینظیر بھٹو کی سرپرستی میں پیپلز پارٹی کی حکومت بن گئی جس کی وجہ سے کشمیر کونسل اور مرکزی حکومت کی دیگر ایجنسیوں کی وجہ سے آزاد کشمیر کی حکومت تقریباً بے بس ہوگئی جس کے اثرات 1990 کے آزاد کشمیر اسمبلی کے الیکشن پر مرتب ہوئے۔

1990 میں آزاد کشمیر اسمبلی کے الیکشن منعقد ہوئے جس وقت مرکز میں پیپلز پارٹی اور ہندوستانی مقبوضہ کشمیر میں 1987 کے الیکشن میں دھاندلی کی اور کشمیر میں مسلح شورش برپا ہونے کی وجہ سے آزاد کشمیر کے حالات بھی دگرگوں ہوگئے تھے۔ کشمیری مجاہدین ٹریننگ لینے کے لیے آزاد کشمیر آنا شروع ہوئے تھے۔ لبریشن فرنٹ نے اس سلسلے میں صف اول کا کام کیا جو 1984 میں مقبول بٹ کی تہاڑ جیل میں پھانسی کے بعد وادی بھر میں متحرک ہوگئی تھی اور دنیا بھر میں اس لیے اپنی شاخیں قائم کر دی تھیں۔ امان اللہ خان جو لبریشن فرنٹ کے لیڈر ہیں اور راجہ محمد مظفر خان نے اس تحریک میں بھرپور کردار ادا کیا ان دنوں ان کو سرکار کی سرپرستی بھی حاصل ہوگئی تھی۔ مظفر آباد میں راجہ مظفر خان کے گھر مجاہدین کا کیمپ لگتا تھا، نہ جانے وہ اچانک کیوں امریکہ چلے گئے اور وہاں کے ہی ہو کے رہ گئے۔ امان اللہ خان پاکستان میں کشمیر کی آزادی اور خودمختاری کی علامت تھے جبکہ راجہ مظفر خان امریکہ میں اس سلسلے میں بہت سرگرم ہیں۔

ادھر سردار عبدالقیوم صاحب کریڈٹ لینے میں لگے کہ وادی میں مزاحمتی تحریک ان کی وجہ سے ہے حالاں کہ آزاد کشمیر حکومت کا اس میں کوئی رول نہیں ہوسکتا کیوں کہ نہ تو آئین کے تحت اور نہ ہی حکومت پاکستان کی پالیسی کے تحت کشمیر کے حوالہ سے اس حکومت کا کوئی کردار ہے۔ سردار صاحب کا کشمیر میں کوئی اثر ورسوخ اور شناسائی بھی نہیں تھی۔ پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت ہونے کے باوجود مقبوضہ کشمیر میں شورش کی وجہ سے پاکستانی افواج کا کردار بڑھ گیا جبکہ آزاد کشمیر میں مجاہدین اور مہاجرین کی سرگرمیاں مکمل طور ان کے کنٹرول میں تھیں۔ پیپلز پارٹی فوج کے اندر کوئی زیادہ مقبول جماعت نہیں رہی ہے اس لیے یہ سارے معاملات اس حکومت سے بالاتر ہی ہوتے تھے۔

آزاد کشمیر میں 1989 میں گیارہ سیاسی اور دینی جماعتوں پر مشتمل ایک کشمیر لبریشن الائنس وجود میں آئی جو کشمیری تحریک حریت اور عسکریت کی مدد کے لیے سامنے لائی گئی جس کا مقصد کشمیر کی آزادی، اس کے پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ الحاق یا خودمختار ریاست کے طور رہنا شامل تھا۔ مسلم کانفرنس الحاق پاکستان کی داعی ہونے کے باوجود اس میں شامل ہوگئی۔ اس تحریک کے سربراہ سابق صدر جنرل ریٹائرڈ حمد حیات خان مقرر ہوئے۔ یہ بھی پاکستانی ایجنسیوں کی اعانت اور مدد سے ہوا۔ ان حالات میں مسلم کانفرنس اپنی واضح سمت مقرر نہ کرسکی۔ لبریشن فرنٹ کو فوقیت دی جانے لگی جو ایجنسیوں کے لیے قابل قبول نہیں تھا حالاں کہ جنرل ضیاالحق نے ان کو کشمیر کی خاطر اپنی گود بھی لے لیا تھا اور کشمیر میں تحریک مزاحمت ان کے ذریعہ زوروں پر پہنچائی۔ ادھر مسلم کانفرنس کی حکومت اور جماعت کنبہ پروری اور کرپشن کی وجہ سے اپنی حیثیت مشکوک بنا بیٹھی تھی۔ سردار سکندر اور سردار عتیق خان میں اختلافات کی خلیج وسیع ہوگئی تھی۔

اس پس منظر میں 21 مئی 1990 میں آزاد کشمیر اسمبلی کے چوتھے الیکشن منعقد ہوئے۔ مسلم کانفرنس اور پاکستان پیپلز پارٹی نے سولہ، سولہ جبکہ آزاد کشمیر مسلم کانفرنس نے تین، تحریک عمل نے ایک اور آزاد امیدواروں نے دو نشستیں حاصل کیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے صدر سردار ابراہیم خان مرحوم تھے جن کی سربراہی میں الیکشن کے دوران دیگر جماعتوں سے اتحاد ہوا۔ سردار صاحب وعدے اور

روایات کے مطابق وزیر اعظم بننا چاہتے تھے لیکن خاندانی جماعت کی آمرانہ سوچ کو سردار ابراہیم خان قابل قبول نہیں تھا۔ بے نظیر صاحبہ نے مرحوم ممتاز حسین راٹھور کو وزارت عظمٰی کا امیدوار بنایا جس نے مسلم کانفرنس کے سابق وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان کو شکست دے کر 29 جون 1990 کو وزارت عظمٰی آزاد کشمیر کا حلف لیا۔ سردار عبدالقیوم خان جو اس وقت صدر تھے نے آئینی ذمہ داریوں سے انحراف کر کے حلف لینے سے انکار کیا لیکن ہدایت کی کہ پیپلز پارٹی کا کوئی بھی کارکن اس سے حلف لے لے۔ اس طرح سردار عبدالقیوم صاحب نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو نہ ماننے کی ابتدا ڈال دی۔ ادھر ممتاز راٹھور نے سردار صاحب کے بیٹے سردار خلیق احمد خان مرحوم کو اپنا مشیر مقرر کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ممتاز راٹھور کا مشیر اسی کے حریف سردار عبدالقیوم خان کے ساتھ صدر ہاؤس میں ہی رہتا تھا۔ ممتاز راٹھور اپنی کابینہ کو کنٹرول نہ کر سکے جس میں سے ہر ایک بہ زعم خود وزیر اعظم تھا۔ وہ کسی کو نکال بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ وہ لوگ مرکزی قیادت کے حکم پر بنائے گئے تھے۔ بدانتظامی اور بے راہ روئی کی انتہا ہوگئی تھی۔ ادھر مرکز میں 6 اگست 1990 کو بے نظیر کی حکومت کی برطرفی اور آزاد کشمیر میں سردار عبدالقیوم خان کے صدر منتخب ہو جانے سے راٹھور صاحب کی حکومت ڈگمگا گئی۔

مسلم کانفرنس اور پیپلز پارٹی۔ مرکزی حکومت اور پیپلز پارٹی میں کھچاؤ اور تناؤ عروج پر پہنچ گیا۔ راٹھور صاحب اس سب کچھ کو نہ سنبھال سکے بالآخر 31 مارچ 1990 کو انہوں نے اسمبلی کو تحلیل کر دیا جس کے ساتھ ہی ان کی حکومت بھی ختم ہوگئی لیکن حیرانی کا مقام ہے کہ جن وزراء پر انہوں نے بد دیانتی۔ بلیک میلنگ کے الزامات لگائے تھے دوبارہ ان کو ہی عبوری عرصے کے لیے اپنا مشیر مقرر کیا۔ چوں کہ اسمبلی کی تحلیل کے بعد وزیر اعظم نئے وزیر اعظم کے انتخاب تک قائم مقام وزیر اعظم رہ سکتے ہیں اس لیے نئے الیکشن تک ''برائے نام'' وزیر اعظم کام کرتے رہے۔

الیکشن 1991

اس عرصہ کے دوران 29 جون 1991 کو آزاد کشمیر اسمبلی کے انتخابات بھی منعقد ہو گئے جن

میں مسلم کانفرنس کو 31 نشستیں حاصل کر کے اکثریت حاصل ہوئی۔ پی پی کو تین جس میں سے دو راٹھور صاحب نے خود جیتیں ایک پر سردار عبدالقیوم کو مظفر آباد کے حلقہ 3 سے شکست دی۔ جمہوری اتحاد نے چار جبکہ دو نشستیں آزاد امیدواروں نے جیتیں۔ مسلم کانفرنس نے آٹھ مخصوص نشستیں جیت کر 31 نشستیں حاصل کر لیں۔ اس شکست سے ممتاز راٹھور خاصے خائف ہو گئے اور پاکستان اور افواج پاکستان کے خلاف وہ کچھ کرنے لگے جو ان کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ممتاز راٹھور صاحب کی ان حرکات کی وجہ سے حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر کے آئین کی دفعہ 56 کے تحت ان کو برطرف کر کے فوج کے ذریعہ حفاظتی تحویل میں لے کر اسلام آباد پہنچا دیا اور آزاد کشمیر میں اس وقت چیف الیکشن کمشنر سردار محمد اشرف خان کو منتظم اعلیٰ مقرر کیا۔ ادھر سردار عبدالقیوم خان مرکز میں میاں محمد نواز شریف کی مدد سے آزاد کشمیر اسمبلی میں علماء مشائخ نشست پر منتخب ہو کر آزاد کشمیر کے وزیر اعظم بنائے گئے۔ جبکہ سردار سکندر حیات خان کو صدر منتخب کیا گیا۔ سردار عبدالقیوم خان کے اس سیٹ پر انتخاب کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ میں اس وقت ویکشن جج تھا مجھ پر دباؤ بڑھایا گیا کہ میں اس پٹیشن کو ابتدائی طور ہی خارج کروں لیکن میں نے معاملہ فل کورٹ کے لیے چیف جسٹس ملک عبدالمجید کو بھیج دیا جنہوں نے اس کو ریاض اختر کے سپرد کر دیا جس نے مبینہ طور پر بابر اعوان سینئر ایڈووکیٹ راولپنڈی کے لکھے ہوئے فیصلہ پر دستخط کر کے رٹ پٹیشن خارج کر دی۔ یہ میرے خلاف باپ بیٹے کی مخاصمت اور، ریاض اختر کی پسندیدگی کی ایک وجہ بن گئی۔ اب تاریخ الٹ ہوگئی۔ سردار سکندر حیات بطور وزیر اعظم جو سلوک اپنے صدر سردار عبدالقیوم خان سے کرتے تھے وہ ان کے بیٹے نے سکندر حیات سے کرنا شروع کر دیا اور اس کو صدر ہاؤس تک محدود کر دیا۔

ادھر کشمیر میں ہندوستان کے خلاف مسلح مزاحمت عروج پر تھی۔ کشمیر کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں براستہ آزاد کشمیر پاکستان میں داخل ہو رہے تھے اور سردار عبدالقیوم خان صاحب یہ ساری کامیابیاں اپنے کھاتے میں ڈالتے رہے۔ اس دوران میں امان اللہ خان جو جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے سربراہ تھے نے مقبول بٹ شہید کی شہادت کی یاد میں جنگ بندی لائن عبور کرنے کی تحریک بذریعہ

نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) چلائی جس کے روح رواں گل نواز بٹ مرحوم تھے۔ ہزاروں لوگ چکوٹھی میں جمع ہو گئے جہاں ہندوستان نے گولیاں چلا کر دو نوجوانوں کو شہید بھی کر دیا۔ بہرحال سردار عبدالقیوم خان نے مرکز میں میاں محمد نواز شریف کی حکومت، مقامی طور فوج کی مدد اور اپنی فہم و فراست سے اس افراتفری پر قابو پا لیا جو راٹھور صاحب نے پیدا کی تھی۔

ان کی حکومت کے دوران عملی طور پر سردار عتیق احمد خان ہی وزیر اعظم کے اختیارات استعمال کرتے تھے جس نے آزاد کشمیر کی انتظامیہ میں ادھم مچا دیا تھا۔ تقرریوں تبادلوں کی بوچھاڑ اور بے ربطہ اور بے سروپا کارروائیوں کی انتہاء کر دی تھی۔ اس نے اپنی جماعت سے تعلق رکھنے والے چار سو سے زائد لوگوں کو ایڈہاک بنیادوں پر گریڈ 5 سے 20 تک بھرتی کر کے اسمبلی کے ذریعہ ایکٹ پاس کروا کر پبلک سروس کمیشن سے مستثنیٰ کرتے ہوئے مستقل کر دیا۔ اس سے آزاد کشمیر بھر میں شدید ردعمل ہوا اور رخ عدالتوں کی طرف مڑ گیا۔ ایڈہاک تقرریوں کے مستقل کرنے کے ایکٹ کو آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس عبدالمجید ملک نے کالعدم قرار دیا جبکہ جنگلات۔ سوشل ویلفیئر اور محکمہ لوکل گورنمنٹ میں ایڈہاک تقرریوں کو میری سربراہی میں بنچ نے کالعدم قرار دیا۔

اپنی مدت حکومت اور صدارت کے آخری دنوں میں سردار سکندر حیات خان نے ایک سیاسی چال چلتے ہوئے صدارت کے عہدے سے استعفیٰ دے کر دوبارہ اسی اسمبلی کے ذریعہ اپنے آپ کو منتخب کروالیا۔ یہ سکندر صاحب کا غیر اخلاقی اور غیر جمہوری عمل تھا۔ نہ معلوم سکندر صاحب جیسے زیرک سیاسی کارکن ایک عمدہ منتظم نے ایسی بے وقار حرکت کیوں کی؟ جو نہ صرف نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں بلکہ سب Reverse بھی ہو گئیں۔ بہرحال مسلم کانفرنس نے کسی نہ کسی طریقہ سے اپنی دوسری مدت حکومت کے پانچ سال بھی مکمل کر لیے۔ یہ آزاد کشمیر حکومت کی جمہوریت کے تسلسل کے لیے اچھا ثابت ہوا۔ تاہم اس عرصہ حکومت کے دوران مرکزی حساس ایجنسیاں آزاد کشمیر حکومت میں مکمل طرح گھس گئی تھیں لیکن واشگاف نظر نہیں آتی تھیں اور یہ سارا کچھ کشمیر میں مزاحمتی عسکری تحریک اور مجاہدین اور مہاجرین کے آزاد کشمیر میں آنے اور عتیق اور ایجنسیوں کی ملی بھگت سے ہوا۔

الیکشن 1996

30 جون 1996 کو آزاد کشمیر اسمبلی کے چھٹے الیکشن منعقد ہوئے جس میں پاکستان پیپلز پارٹی نے مہاجرین مقیم مہاجرین کی بارہ میں سے گیارہ نشستیں اور مجموعی طور سینتیس (37) نشستیں حاصل کر لیں۔ مسلم کانفرنس نے 9، مسلم لیگ جونیجو نے ایک اور جماعت اسلامی نے ایک نشست حاصل کی۔ یہ مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت ہونے کی وجہ سے ہوا اور آزاد کشمیر میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مہاجرین کی نشستوں پر مسلم کانفرنس نے بائیکاٹ کر لیا تھا نتائج ان کو معلوم تھے کیوں کہ مرکز میں ان کی خیر خواہ حکومت کی صورت میں ان کے حق میں بھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔ چوہدری سلطان محمود کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا جبکہ سردار سکندر حیات خان کو عدم اعتماد کے ووٹ کے ذریعہ برطرف کر کے مرحوم سردار محمد ابراہیم خان کو صدر منتخب کیا گیا۔ واقفان حال بتاتے ہیں کہ سردار سکندر حیات کو بچانے کے لیے نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم اور خود بے نظیر صاحبہ بھی متحد ہو گئی تھیں، لیکن مقامی طور سلطان محمود اور سردار عبدالقیوم خان نے، سردار ابراہیم خان مرحوم کو صدر بنانے کے لیے سردار سکندر کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد کی حمایت کی تھی۔

راٹھور صاحب کو اس اسمبلی کا سپیکر بنایا گیا لیکن جون 1998 میں عدم اعتماد کے ذریعہ برطرف کر دیئے گئے۔ اس اسمبلی میں پہلی بار جماعت اسلامی کو ایک نشست ملی جو باغ سے عبدالرشید ترابی نے حاصل کی۔ نام کو تو یہ نشست جماعت اسلامی سے منسوب تھی لیکن فی الواقع ترابی صاحب کی برادری کی نشست تھی۔ چوہدری سلطان محمود نے انتہائی چابک دستی اور موقع شناسی سے اپنی وزارت عظمیٰ کو بچائے رکھا حالاں کہ مرکز میں 1997 میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمہ کے بعد مسلم لیگ کی نواز شریف کی سربراہی میں حکومت بن گئی تھی۔ اسی دوران سال 1999 میں کارگل کے محاذ پر ہندو پاک جنگ نے ملک میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی لیکن سلطان محمود نے دم دبا کر اپنے کام سے کام رکھا اور سردار عبدالقیوم خان کی پالیسی اپنائی کہ اگر آزاد کشمیر میں کوئی مداخلت ہوئی تو ہندوستان اس کو

ایکسپلائیٹ کرے گا۔

کارگل جنگ کے فوراً بعد 12 اکتوبر 1999 کو میاں نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹ کر جنرل مشرف نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ملک بھر میں مارشل لا نافذ ہو گیا لیکن آزاد کشمیر میں حکومت بدلے بغیر ایجنسیوں نے بغیر کسی کاغذی ریکارڈ کے حکومت کے معاملات سنبھال لیے۔ سلطان محمود نے اپنی وزارت عظمیٰ بچانے کے لیے چپ سادھ لی اور سائیکلوسٹائل مشین کی طرح مری کے جنرل اور اس کے مظفر آباد میں کارندوں کی ہدایت پر حکومت کے تمام احکامات جاری کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ہندوستانی کشمیر میں گورنر راج نافذ رہا اور اس کا سلطان محمود اور حکومت پاکستان نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ سلطان محمود انتہائی تابعداری سے ملٹری آفیسرز کے احکام بجالاتے رہے، اس لیے اس کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اسی دوران آزاد کشمیر میں احتساب بیورو کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے کچھ مدت کے لیے ایک جنرل کی سربراہی میں آزاد کشمیر کے سیاستدانوں اور بیوروکریسی میں خوف طاری کر دیا لیکن کسی خاص کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سلطان محمود نے جولائی 2001 تک اپنی حکومت کی پانچ سالہ مدت پوری کر لی۔

الیکشن 2001

جولائی 2001 کو اسمبلی کے جنرل انتخابات منعقد ہوئے جس کے نتیجہ میں مسلم کانفرنس نے 21 نشستیں لے کر اکثریت حاصل کی۔ جبکہ پی پی کو پندرہ۔ آزاد امیدواروں کو تین اور ایک مسلم لیگ نے مہاجرین کے حلقہ سے حاصل کی۔ مری کے جنرل آفیسر کمانڈنگ کی ہدایت پر سردار سکندر حیات کو وزیراعظم منتخب کیا گیا حالاں کہ اس وقت مسلم کانفرنس کی اکثریت کی حمایت سردار عتیق خان کو حاصل تھی، وہ بھی اسمبلی کا ممبر تھا اور حساس ایجنسیوں کے ماتحت اہلکاران کے ساتھ اس کی مکمل ملی بھگت تھی۔ یہ الیکشن جنرل مشرف کی حکومت کے دوران پہلے الیکشن تھے جو یقیناً منصفانہ تھے اور ان میں دھاندلی کے الزامات نہیں لگے۔ البتہ الیکشن سے پہلے آزاد کشمیر میں ایک قانونی ترمیم عمل میں آئی جس کے تحت

اسمبلی کے ممبر کے لیے میٹرک تک تعلیم یافتہ ہونے کا معیار مقرر کیا گیا۔ اس قانون کی وجہ سے سردار عبدالقیوم صاحب کی پارٹی بلکہ ان کی ذات سے تعلق رکھنے والے اکثر امیدوار متاثر ہو رہے تھے جنہوں نے ہائی کورٹ میں ایک رٹ دائر کی جس کا فیصلہ میری سربراہی میں فل بنچ نے کیا اور اس قانون کو جائز قرار دیا۔ ریاض اختر کی بھرپور خواہش تھی کہ رٹ خارج کی جائے لیکن آئین کی روشنی میں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا محض سردار عبدالقیوم خان یا عتیق خان یا ان کے چند طرفداروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ایک اچھے قانون شق کو کالعدم قرار دینا عقلمندی نہیں تھی۔

سردار عبدالقیوم خان صاحب کی خواہش تھی کہ وہ صدر بن جائیں لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کیوں کہ جنرل مشرف نے آزاد کشمیر کے پونچھ سے تعلق رکھنے والے ایک حاضر سروس جنرل کو استعفیٰ دلا کر قانون میں خصوصی ترامیم کروا کر یکم اگست کو صدر منتخب کروالیا۔ یہ شخص افواجِ پاکستان کی طرف سے آزاد کشمیر میں چوتھا صدر تھا پہلے تین کرنل علی احمد شاہ، جنرل عبدالرحمن اور جنرل محمد حیات خان تھے۔ جنرل انور کے صدر بننے پر ہندوستان کے وزیراعظم منموہن سنگھ نے کہا کہ ''مقبوضہ کشمیر میں الیکشن تو ہوئے لیکن اختیار ایک فوجی جنرل کو دیا گیا۔'' سچی بات یہ ہے کہ پاکستان میں اقتصادی ترقی اور جمہوریت کی بنیاد جنرل ایوب خان نے انڈسٹری اور بنیادی جمہوری اداروں کو متعارف کروا کر رکھی تھی۔ لیکن دو مہم جو جرنیلوں (جنرل ضیا اور جنرل مشرف) نے پاکستانی فوج کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر کے متنازع بنایا، وگرنہ پاکستانی فوج کی لوگ پوجا کرتے تھے۔ بھلا ہو جنرل کیانی اور راحیل شریف کا انہوں نے فوج کو سیاست سے الگ کر کے اس کا وقار بحال کیا۔

جنرل انور کا خیال تھا کہ اس کو آزاد کشمیر میں جنرل مشرف جیسے اختیارات حاصل ہوں گے اور وہ اسی زعم کو جتلاتے بھی رہے۔ لیکن سردار سکندر حیات خان نے ان کی تو ایک نہ مانی لیکن مقامی ایجنسیوں کے میجر اور کرنل جو چاہیں کروا لیتے تھے۔ سردار سکندر کی ہر مہینے مری جنرل کے پاس پیشی ہوتی تھی یا وہ خود آزاد کشمیر آ کر آزاد کشمیر حکومت کی کلاس لیتا تھا۔ ایک دن سردار سکندر نے بیان دیا کہ ''اب وہ بوڑھے ہو چکے ہیں مری کی سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتے۔'' یہ الفاظ اس کی حکومت میں فوج کی بے جا

مداخلت کا واضح ثبوت تھے۔عدلیہ میں بھی فوج نے اپنے پنجے گاڑ لیے تھے۔ہائی کورٹ میں دو جج ان کی مرضی کے بغیر فائلوں پر حکم درمیانہ بھی نہیں لکھتے تھے۔فوجی ایجنسیوں میں سے MI کی دخل اندازی حدود پھلانگ گئی تھی کیوں کہ جنرل مشرف کا ایک رشتہ دار جنرل اعجاز ندیم اس ایجنسی کا سربراہ تھا جس نے ISI کو کھڈے لائن لگا دیا تھا۔تاہم ISI مجاہدین، مہاجرین اور کشمیر کے معاملات میں کلی اختیار رکھتی تھی اور بہترین کام کیا۔سردار سکندر کے لیے سردار عتیق احمد خان نے جماعت کے اندر مشکلات پیدا کیں تھیں جس کو 2002 میں جماعت کا صدر بنا دیا گیا تھا۔اس طرح سکندر صاحب کو یہ بیک وقت جی او سی مری، جنرل انور، سردار عتیق اور پیپلز پارٹی کے ہاتھوں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن جنرل مشرف آزاد کشمیر میں ہندوستانی کشمیر کی حالت کے پیش نظر کسی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

اس سارے عرصے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے حوالہ سے غیر معمولی واقعات بھی رونما ہوئے جن میں ساؤتھ ایشین فری میڈیا ایسوسی ایشن کا قیام، کشمیر کی حریت کانفرنس کے سربراہوں کا آزاد کشمیر کا دورہ، 15 اپریل 2005 کو مظفر آباد سرینگر بس سروس براستہ چکوٹھی۔تاثر یہ دیا گیا کہ یہ سب کچھ آزاد کشمیر حکومت کی طرف سے یا وزارت خارجہ کر رہی ہے۔لیکن یہ سب کچھ ان کے نام پر مرکزی ایجنسیاں کر رہی تھیں۔یہ سب لوگ ان کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہے تھے۔اس عرصہ میں قدرت نے بھی اپنا آپ دکھایا جب 8 اکتوبر 2005 کو قیامت خیز زلزلہ ہوا جس میں مظفر آباد شہر، مضافات، پونچھ، باغ اور بالا کوٹ پاکستان کی جانب، اوڑی اور کرناہ ہندوستانی کشمیر کی جانب قیامت خیز بربادی کا شکار ہوئے۔اس مرحلہ پر سکندر حیات خان وزیر اعظم آزاد کشمیر نے کہا تھا کہ ''میں قبرستان کا وزیر اعظم ہوں۔'' اب آزاد کشمیر کا رہا سہا انتظامی ڈھانچہ تباہ ہونے کی وجہ سے سارا کنٹرول فوج اور اس کی زیر نگرانی عسکری تنظیموں کے اختیار میں چلا گیا۔لیکن نام کو سردار سکندر حیات کی حکومت تھی جس کو فی الواقع نام نہاد حکومت کہا جا سکتا ہے۔

سردار سکندر حیات کی حکومت کے دوران ہی مجھے دو بار سرینگر جانے کا اتفاق ہوا ایک بار تو بذریعہ واہگہ گیا جبکہ دوسری بار مظفر آباد سرینگر بس کے ذریعہ جب سرینگر مظفر آباد پہلی بس چلی اس وقت

مجھے بھی جانے کو کہا گیا تھا لیکن میں چوں کہ چند دن قبل واپس آیا تھا میں نے[341] معذرت کر کے امجد مرحوم نامی ایڈووکیٹ کو اپنی جگہ نامزد کیا۔

الیکشن 2006

2006 کے الیکشن کی نگرانی جی او سی مری جنرل ظہیر السلام (جو ڈی جی، آئی ایس آئی کے طور بدنام ہو کر ریٹائرڈ ہوئے) اور مقامی طور پر MI کے بریگیڈیئر غضنفر کر رہے تھے۔نتائج پری پلانڈ تھے اور وزیر اعظم کے لیے عتیق خان کا نام حتمی ہو چکا تھا جو فوج کے منظور نظر تھے۔سردار عبدالقیوم خان مرحوم کی جنرل مشرف کے ساتھ الیکشن سے قبل ایک ملاقات کو ٹی وی پر نمایاں کوریج دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی گئی کہ آئندہ وزیر اعظم سردار عبدالقیوم خان ہوں گے۔اس خبر سے ابتدا، بعد کے انتہا کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔سلطان محمود کو پنجاب کے جاٹ برادران چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کی حمایت حاصل تھی جو صدر بننے کے خواب دیکھ رہے تھے جبکہ جنرل انور بھی ایسی خواہش رکھتے تھے لیکن اب وہ کسی کے منظور نظر نہ رہے تھے۔11 جولائی 2006 کو الیکشن منعقد ہوئے۔اس الیکشن میں تاریخ کی بدترین دھاندلی عمل میں آئی اور یہ سب کچھ الیکشن کمیشن اور MI کی ملی بھگت سے ہوا۔مسلم کانفرنس نے 22، پی پی نے 6، مسلم لیگ ق نے 4، جموں و کشمیر پی پی ایک مسلم کانفرنس نے مخصوص نشستیں بھی حاصل کر لیں۔آزاد کشمیر اسمبلی کے لیے جنرل مشرف کی مہربانی سے MQM سے پہلی بار کراچی سے دو ممبر منتخب ہوئے۔سردار سکندر حیات اور اس سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ہر حلقہ سے ہرایا گیا۔MI کے بریگیڈیئر غضنفر ہر سرکاری میٹنگ اور الیکشن کی سرگرمیوں میں نمایاں رہتے تھے۔لوگوں کو مسلم کانفرنس میں شریک کرواتے۔کئی امیدواروں کو مسلم کانفرنس کے ٹکٹ انہوں نے خود سیاسی میٹنگوں میں دیئے۔

23 جولائی 2006 کو سردار عتیق احمد خان وزیر اعظم اور 27 جولائی کو راجہ ذوالقرنین خان کو صدر منتخب کیا گیا۔یہ دونوں نام ایجنسیوں نے فائنل کیے تھے۔عتیق خان ہندوستانی کشمیر میں عمر عبداللہ کی جماعت اور پاکستان میں جنرل مشرف کے چار نکاتی فارمولہ کے واحد حامی سیاستدان تھے جو عام

کشمیری کے لیے نا قابل قبول بات تھی۔عتیق خان نے جنرل ندیم اعجاز اور MI کی مدد سے 2006 میں میرے آزاد کشمیر میں چیف جسٹس بننے میں مخالفت کی۔ روٹین میں ہونے والی سینئر موسٹ جج، جو میں تھا، کی بطور چیف جسٹس تقرری کے خلاف عتیق خان، راجہ ذوالقرنین صدر آزاد کشمیر کو لے کر جنرل مشرف سے ملے اور کہا کہ اگر وہ لوگ کشمیر کی حکومت کریں گے تو منظور گیلانی ان کے لیے چیف جسٹس قابل قبول نہیں ہوسکتا۔اس میں ان کی مدد جنرل ندیم اعجاز نے کی جس نے میرے ہندوستانی کشمیر کے دورہ کے دوران وہاں کے گورنر، چیف منسٹر اور دیگر سرکاری عہدیداروں سے ملنے کو Exploit کیا۔

2007 میں پاکستان کے چیف جسٹس افتخار احمد چوہدری کے خلاف جنرل مشرف کے ریفرنس سے ملک بھر میں مشرف کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے۔ میں نے بطور جج 29 مارچ 2007 کو راولپنڈی بار کے فنکشن میں شرکت کی اور جنرل مشرف کے خلاف دھواں دار تقریر بھی کی جس کی وجہ سے مجھے اور میری فیملی کو کافی پریشانی برداشت کرنا پڑی۔ میں نے اپنے حقوق کے لیے سپریم کورٹ پاکستان میں پٹیشن دائر کی جس نے ملک بھر میں نئی بحث شروع کر دی کیوں کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اور آزاد کشمیر میں حکومت پاکستان کی بالادستی کو کسی نے چیلنج نہیں کیا تھا۔ یہ پاکستان کے لیے بین الاقوامی سطح پر بڑی سبکی کا باعث تھا۔ایجنسیوں نے مجھے بہت ڈرایا دھمکایا کہ میں یہ کیس واپس لوں لیکن میں نے نہیں مانا۔ایک بریگیڈیئر نے میرے گھر آ کر کہا کہ آپ کے کیس کی وجہ سے پاکستان کی بدنامی ہو رہی ہے اس کو واپس لے لیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر میرے ساتھ ناانصافی سے پاکستان کی نیک نامی ہوئی ہے یا کوئی فائدہ ملا ہے تو مجھے بتائیں میں مقدمہ واپس لے لوں گا۔اس پر وہ لاجواب ہو گیا۔اس کے بعد آزاد کشمیر میں بھی ایک لہر چل پڑی اور آزاد کشمیر کی عدلیہ میں دھاندلی ملک بھر میں موضوع بحث بن گئی۔اس دوران 27 دسمبر 2007 کو لیاقت باغ راولپنڈی میں انتخابی جلسہ کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کو قتل کیا گیا جس کے بعد 18 فروری 2008 کو الیکشن ہوئے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم بنے۔ جنرل مشرف 18 اگست 2008 کو مستعفی ہو گئے کیوں کہ وہ اس سیاسی دباؤ کو نہ سہہ سکے جو جسٹس افتخار چوہدری کے خلاف ریفرنس کی وجہ سے سیاست دانوں نے

بڑھایا جس میں نمایاں کردار میاں محمد نواز شریف اور مرحومہ بے نظیر بھٹو کا تھا۔341

ادھر مسلم کانفرنس کی دھڑے بندیوں، سلطان محمود کی پارٹی اور مقامی پیپلز پارٹی کے دباؤ کی وجہ سے عتیق خان جس کی پوزیشن الیکشن کے بعد عدلیہ میں اتنے بڑے پیمانے پر دھاندلی کرانے کی وجہ سے پہلے ہی کمزور تھی مزید کمزور پڑ گئی، جس کی وجہ سے اس کو عدم اعتماد کے ووٹ کے ذریعہ 6 جنوری 2009 کو برطرف کر کے سردار محمد یعقوب خان کو آزاد کشمیر کا وزیر اعظم منتخب کیا گیا جس نے 6 جنوری 2009 کو وزارتِ عظمیٰ کا حلف لیا لیکن اس کی بیل بھی منڈے نہ چڑھ سکی اور عدم اعتماد کے نتیجے میں 22 اکتوبر 2009 کو برطرف کر کے راجہ محمد فاروق حیدر خان کو وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔اب کی بار سابقہ مخالفین حلیف بن گئے۔

اس عرصہ میں میری پاکستان سپریم کورٹ میں پٹیشن اور آزاد کشمیر اور پاکستان بھر میں اس کے حق میں فضا کی وجہ سے فاروق حیدر نے ریاض اختر چوہدری چیف جسٹس کے خلاف بد دیانتی اور بدمعاملگی پر مبنی ایک ریفرنس بذریعہ قائم مقام صدر شاہ غلام قادر سپریم جوڈیشل کونسل میں دائر کروایا۔ یہ فیصلہ عوامی امنگوں کے عین مطابق تھا۔ میں نے قائم مقام چیف جسٹس کا حلف لے کر چوہدری اعظم کو فارغ کرتے ہوئے چوہدری ابراہیم ضیا کی بطور ایڈہاک جج تقرری کی۔ان دنوں صدر راجہ ذوالقرنین بیرون ملک دورے پر گئے ہوئے تھے جو دوسرے ہی دن واپس آئے اور ایک لاحاصل مشق کرتے ہوئے ریاض اختر کے خلاف ریفرنس واپس اور چوہدری اعظم کو بطور ایڈہاک جج بحال کیا۔لیکن یہ بیل منڈے نہ چڑھ سکی۔فاروق حیدر ریفرنس پر قائم رہے اور سپریم جوڈیشل کونسل نے کارروائی جاری رکھی۔فاروق حیدر کے اس عمل سے اس کے حق میں عوام میں بے حد مقبولیت ہوئی جبکہ ایجنسیوں اور اس وقت کی پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کی مخالفت کی انتہا ہو گئی۔ایجنسیاں اور مرکزی حکومت دونوں ریاض اختر کی حمایت کرتے تھے۔ بہ ایں ہمہ سپریم جوڈیشل کونسل نے ریاض اختر کو بد دیانتی کا مرتکب قرار دیا لیکن حکومت پاکستان نے آئین کے مطابق نوٹیفکیشن جاری نہیں کیا۔اس کے برعکس ریاض اختر چوہدری سے اسی جنرل ظہیر السلام نے استعفیٰ لے لیا جس نے اس کو استعمال کر کے آزاد کشمیر کے الیکشن

میں دھاندلی کروا کر عتیق خان کو جتوایا تھا۔ اس کے استعفیٰ کے بعد میں نے بھی استعفیٰ دے دیا کیوں کہ میرے چیف جسٹس قائم رہنے سے خرابی زیادہ اور بہتری کم ہوتی۔ اس معاملہ کی تفصیل دوسری جگہ پر درج کی گئی ہے۔ بالخصوص فاروق حیدر اور میرے استعفیٰ کے باب میں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد فاروق حیدر کو بھی اس گستاخی کی پاداش میں مرکزی حکومت اور اس کی ایجنسیوں نے عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعہ 29 جولائی 2010 کو برطرف کروا کر دوبارہ سردار عتیق خان کو وزیر اعظم منتخب کروانے کا فیصلہ کیا لیکن اس نے خود ہی استعفیٰ پیش کر دیا۔ اب عتیق خان مرکزی ایجنسیوں کے علاوہ مرکزی پیپلز پارٹی کی حکومت کی غلامی میں بھی آ گئے۔ اس طرح آزاد کشمیر اسمبلی کے 2006 کے دھاندلی زدہ الیکشن نے آزاد کشمیر کی سیاست کی چولیں ہلا دیں۔ دسمبر 2010 میں فاروق حیدر کی قیادت میں آزاد کشمیر میں مسلم لیگ (ن) کی بنیاد پڑی اور اس کا باقاعدہ قیام میاں محمد نواز شریف نے 26 دسمبر 2010 کو یونیورسٹی کالج گراؤنڈ میں عمل میں لایا جہاں میں نے بھی میاں صاحب کی دعوت پر مسلم لیگ میں عملی شمولیت کا اعلان کیا۔

الیکشن 2011

آزاد کشمیر اسمبلی کے نئے انتخابات 26 جون 2011 کو عمل میں آئے جن میں آزاد کشمیر پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ 26 جولائی 2011 کو چوہدری عبدالمجید کو قائد ایوان منتخب کیا گیا جو آزاد کشمیر کے وزیر اعظم بنے۔ چوہدری صاحب اس سے پہلے 5 بار آزاد کشمیر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے جو پیپلز پارٹی کے کہنہ مشق کارکن اور اپنے آپ کو ''لاڑکانہ کا مجاور'' کہتے ہیں۔ سردار محمد یعقوب خان کو ڈرامائی طور پر صدر منتخب کیا گیا حالاں کہ مظفر آباد سے چوہدری محمد لطیف اکبر کو اس منصب کے لیے موزوں امیدوار قرار دیا گیا تھا، لیکن پاکستان میں سیاسی جماعتیں مرکزی لیڈر شپ کی ڈکٹیٹر شپ میں ہوتی ہیں کسی نے اس فیصلہ پر اعتراض کرنے کی جرات بھی نہیں کی اور نہ ہی لطیف اکبر نے اس پر کوئی احتجاج کیا کیوں کہ ان کو اس کے سنگین نتائج کا احساس تھا۔ عمومی تاثر یہ ہے کہ یعقوب خان نے

زرداری صاحب کو کروڑوں روپے دے کر صدارت خریدی ہے۔

اس حکومت کا آزاد کشمیر میں کوئی اچھا تاثر نہیں رہا کیوں کہ ان کا مکمل کنٹرول لاڑکانہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں اور ان کے ملازمین کے پاس رہا تھا۔ ان کو جیسا کہا جاتا تھا، ویسا کرتے تھے۔ جن لوگوں کے لاڑکانہ والوں سے تعلقات تھے وہ بھی ان پر حاوی تھے۔ بیرسٹر سلطان محمود تمام تر کوششوں، قابل قبول اور قد آور ہونے کے باوجود، چوہدری عبدالمجید کے مرکزی قیادت کے ساتھ گہرے تعلقات کی وجہ سے کچھ نہ کر سکے، حالاں کہ ہر روز بیرسٹر یہ تاثر دیتے رہے کہ مجید کی حکومت صبح گئی کہ شام گئی۔ دونوں چوہدری مرکزی قیادت کو منانے کے لیے مختلف حیلے بہانے تراشتے رہے، پاکستان کے اندر اور یورپ میں مرکزی قیادت کی خدمت خاطر بھی کرتے رہے۔ 2014 میں بیرسٹر سلطان محمود نے لندن میں کشمیر ملین مارچ کے نام سے اور چوہدری عبدالمجید نے مانچسٹر میں کشمیر کانفرنس کے نام سے ہزاروں لوگوں کو جمع کر کے بلاول کی پذیرائی کی۔ غلام قوموں کا یہی وطیرہ ہے۔

بیرسٹر سلطان سلجھے ہوئے سیاسی کارکن ہیں لیکن پارٹیاں بدلنے کی وجہ سے ان کا تاثر اچھا نہیں، جبکہ مجید پیپلز پارٹی کے ساتھ غیر مشروط طور پر منسلک رہے۔ اس حکومت میں انتظامی صلاحیتوں کا فقدان اور برادریوں کی بنیاد پر مفادات بٹتے رہے۔ آزاد کشمیر میں یہ پہلی حکومت بنی جو خالصتاً مرکزی پارٹی لیڈر شپ کی نامزد تھی اس میں ایجنسیوں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ زرداری صاحب اور میاں نواز شریف صاحب کے درمیان مفاہمت کی وجہ سے مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت بدلنے اور مقامی مسلم لیگی قیادت اور بیرسٹر سلطان محمود کی کوششوں کے باوجود میاں صاحب نے اس حکومت کو نہ چھیڑا اور نہ ہی اس کے کام کاج میں رکاوٹ ڈالی۔ مقامی طور پر ایجنسیاں یقیناً اثر انداز ہوتی ہیں، لیکن اگر فیصلہ مرکزی سطح کی سیاسی لیڈر شپ کا ہو تو ایجنسیوں کی دال نہیں گلتی۔ یہ اچھی اور خوش آئند روایت پڑتی جا رہی ہے۔

بیرسٹر سلطان محمود، پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت سے مایوس ہو کر اب عمران خان کی پاکستان تحریک انصاف میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ ان کی سیاسی زندگی کا تاریک ترین پہلو ہے۔ اس کے بعد وہ اسمبلی سے اپنی نشست سے مستعفی ہو کر دوبارہ پی ٹی آئی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے۔ آزاد کشمیر

میں سب حکومتیں کشمیر کی آزادی کے نام پر بنتی اور چلتی ہیں جبکہ تحریک میں اس کا کوئی کردار نہیں ہے۔ روزگار کا ایک ذریعہ ہے جہاں ترقیاتی بجٹ 20% اور غیر ترقیاتی 80% فیصد ہے۔ پیپلز پارٹی کی 2011-2016 کی حکومت سردار عبدالقیوم خان مرحوم کی 96-1991 کی حکومت کی طرح بے ہنگم، افراتفری اور بے ضابطگی میں یکساں حیثیت رکھتی ہے۔ جن میں اداروں میں توڑ پھوڑ، میرٹ کا قتل، بجٹ کا ضیاع نکتہ عروج پر رہا۔ اعلیٰ عدالتوں میں تقرریوں کا مذاق، اعلیٰ عہدے دار، عدالتی امتناعی احکامات پر عہدوں پر متمکن رہے۔ مرکزی جماعت کے عہدے دار عملی طور حکومت کرتے رہے۔ بنیادی Infrastructure کے بغیر میڈیکل کالج اور جگہ جگہ یونیورسٹی کے کیمپس سیاسی بنیادوں پر قائم کیے گئے، جو بظاہر ٹھیک، لیکن مستقبل میں کوالٹی کا فقدان اور بیروزگاری کا بحران پیدا کریں گے۔

الیکشن 2016

آزاد کشمیر اسمبلی کے دسویں الیکشن 21 جولائی 2016 کو منعقد ہوئے۔ چیف الیکشن کمشنر غلام مصطفی مغل، چیف جسٹس ہائی کورٹ نے تمام سرکاری اداروں جن میں فوج، سول بیوروکریسی، سیاسی جماعتیں، وکلاء اور سول سوسائٹی کے اعتماد سے عمدہ ضابطہ اخلاق مرتب کیا جس پر سختی سے عمل بھی کرایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد کشمیر میں ہر لحاظ سے صاف، شفاف، غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات ہوئے۔

سچی بات یہ ہے کہ مجھے خدشہ تھا کہ چیف جسٹس کو سیاست دان متنازع بنا دیں گے جس کے بعد ان کی ذات اور ادارہ ہدفِ تنقید بنے گا اور بے وقار ہو جائے گا۔ اس وجہ سے میں نے ان کو ذاتی طور پر بھی یہ عہدہ قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا، متعلقہ اداروں کو بھی ایسا ہی کہا اور خود بھی اس کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میرے سارے خدشات غلط ثابت ہوئے اور آزاد کشمیر کی تاریخ کے بہترین الیکشن ہوئے۔ پاکستانی فوج نے اس سلسلے میں بھرپور معاونت کر کے ان کو پرامن اور شفاف بنایا۔ فوج یا اس کی ایجنسیوں کی کسی بھی جگہ سے 2006 کے الیکشن کے برعکس کسی کے حق میں یا

کسی کے خلاف استعمال ہونے کی کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔ غلام مصطفی مغل صاحب کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ اپنی شیریں زبانی سے ہر ایک بلکہ متحارب فریقین کو اپنا ہونے کا گمان دیتے ہیں۔

اس الیکشن کے نتیجہ میں پاکستان مسلم لیگ ن نے 31، پاکستان پیپلز پارٹی نے 3، مسلم کانفرنس نے 3 اور تحریک انصاف نے مہاجرین کی نشستوں میں سے دو نشستیں حاصل کیں۔ سردار خالد ابراہیم کی پیپلز پارٹی کو سوائے ان کی ذاتی سیٹ کے اور کوئی سیٹ نہیں مل سکی ہے۔ جبکہ مسلم کانفرنس اور تحریک انصاف کے اتحاد کو لوگوں نے ناپسند کر کے مسترد کر دیا۔ جو نشستیں انہوں نے حاصل کیں وہ ان امیدواروں کی ذاتی اور برادری کی نشستیں ہیں ان کا جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس الیکشن میں جماعت اسلامی کا کردار مجھے پسند نہیں آیا جس نے مختلف حلقوں میں باہم متحارب اور متضاد خیال جماعتوں کے ساتھ الگ الگ اتحاد اور کسی جگہ اپنی جماعت کے نشان پر انتخاب لڑا۔ حسب معمول کسی بھی جگہ کامیابی نہیں مل سکی۔ لیکن امیر جماعت اسلامی عبدالرشید ترابی صاحب کو اسمبلی میں ٹیکنوکریٹ کی سیٹ پر وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کے پسندیدہ مشتاق احمد منہاس کی حمایت کرنے کے صلے میں ممبر لیا گیا۔ نہ معلوم مخصوص نشست کی کس کیٹگری میں آتے ہیں، لیکن بذات خود بے پناہ خوبیوں کے حامل ہیں۔

خواتین کی مختص نشستوں پر تین کو تو مرکزی مسلم لیگی قیادت نے خود نامزد کر کے تھوپ دیا جبکہ ایک مظفر آباد کے مقامی مسلم لیگی کارکن کی بیٹی کے حصے میں آئی جو مقامی قیادت کی سفارش پر منتخب ہوئی۔ مسلم لیگ کے اراکین کی مدد سے ایک خاتون پیپلز پارٹی کی بھی منتخب ہوئی حالاں کہ ایک سیٹ جموں وکشمیر پیپلز پارٹی (خالد ابراہیم) کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کے مفاہمتی فارمولہ کا اطلاق اس سیٹ کے علاوہ عتیق خان کو قائد حزب اختلاف بننے سے روکنے کے لیے چوہدری یاسین ایم ایل اے کو قائد حزب اختلاف بھی نوٹیفائی کیا گیا۔ خدا لگتی بات یہ ہے کہ قائد حزب اختلاف سردار عتیق خان ہی بچ سکتے تھے۔ اگر وہ قابل قبول نہ تھے تو خالد ابراہیم کو بنایا جاتا لیکن مفاہمتی فارمولہ سبقت لے گیا اور چوہدری یاسین کو قائد حزب اختلاف بنایا گیا۔ سیاست بے رحم، بے مروت اور

اخلاق سے عاری کھیل ہے۔اس سے قبل تیس جولائی کومنتخب ممبران اسمبلی نے حلف لیا جس کے بعد شاہ غلام قادر بطور سپیکر اور سردار طاہر کو بطور ڈپٹی سپیکر منتخب کیا گیا۔ وزیر اعظم پاکستان جو مسلم لیگ ن کے مرکزی صدر اور قائد ہیں نے راجہ محمد فاروق حیدر کو وزیر اعظم نامزد کیا جس کا انتخاب 31 جولائی کو ہوا اور اسی شام چار بجے وزیر اعظم نے حلف بھی اٹھایا جس میں چند مرکزی وزرا بھی شامل ہوئے۔ میری اسی روز راجہ فاروق حیدر سے رسمی ملاقات ہوئی۔اور ایک بار کشمیر سے آنے والی ایک صحافی کے ساتھ ملاقات ہوئی۔اس کے علاوہ ہمارا کبھی رابطہ نہیں ہوا۔شاہ غلام قادر یا مشتاق منہاس کو وزیر اعظم نامزد کیے جانے کی افواہ عام تھی لیکن قیادت نے قابل قبول شخص کو نامزد کر کے اچھا فیصلہ کیا۔شاہ غلام قادر کی خواہش صدر بننے کی بھی تھی لیکن فاروق حیدر نے کہا کہ وہ کسی منتخب ممبر کو نامزد کر کے اس کی سیٹ ضائع نہیں کر سکتا۔

2 اگست کو راجہ محمد فاروق حیدر کی وزیر اعظم پاکستان سے ملاقات ہوئی جہاں مسعود خان ایمبیسیڈر کو آزاد کشمیر کا صدر نامزد کیا گیا۔صدرات کے لیے مسعود خان کے علاوہ سردار خالد ابراہیم، سردار سکندر حیات اور میرا نام زیر بحث تھے۔راجہ فاروق حیدر خان کے وزیر اعظم بننے کے بعد سکندر حیات خان کی وجہ سے قابل قبول نہیں رہے کہ دو بڑے عہدے راجپوتوں کو دینا مناسب نہیں۔ خالد ابراہیم اپنی سخت گیری کی وجہ سے نا قابل قبول تھا جبکہ میری مخالفت میں یہ دلیل دی گئی کہ صدر اور وزیر اعظم ایک ہی ضلع یا شہر سے نہیں ہونے چاہئیں۔اس کی پلاننگ پہلے سے کی گئی تھی۔ فاروق حیدر خان کے متعلقہ لوگوں نے مسعود خان کا نام تجویز کروایا۔مسعود خان کی نامزدگی کا عمومی تاثر اچھا نہیں ہے۔خالد ابراہیم جو رشتے میں ان کے چچا ہیں نے اسی اصول پر ان کی مخالفت بھی کی کہ وہ غیر سیاسی شخص ہے اور حکومت پاکستان کی نمائندگی کرتا رہا ہے۔ گو کہ مسعود خان ایک قابل بیوروکریٹ، ڈپلومیٹ ہیں۔چین اور یو این میں پاکستان کے ایمبیسیڈر بھی رہ چکے ہیں۔اس لحاظ سے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا جو ریاست کے باشندے بھی ہیں۔لیکن جس شخص نے تیس سال وزارتِ خارجہ کی سروس کی ہو اور وہاں سے استعفیٰ دے کر آزاد کشمیر کا صدر منتخب کرایا جائے، انتہائی غیر جمہوری اور غیر

سیاسی عمل ہے۔اس پر طرہ یہ ہے کہ مسعود خان کا ووٹ بھی آزاد کشمیر کے کسی 341 حلقہ انتخاب میں درج نہیں تھا۔جس کے لیے حکومت نے مختلف اداروں پر دباؤ ڈال کر ان کا ووٹ درج کرایا۔اس میں سب اداروں کی ملی بھگت شامل تھی۔ حد تو یہ ہے کہ مسعود خان صاحب کا قومی شناختی کارڈ اور ریاستی باشندہ کا سرٹیفکیٹ بھی ان ہی دنوں میں بنایا گیا جو سارا عمل تین چار دن میں مکمل کیا گیا۔ان کے انتخاب کی وجہ ان کے بین الاقوامی تجربہ کے حوالے سے مسئلہ کشمیر پر ان سے کام لینا ہے۔ مسئلہ کشمیر پر آزاد کشمیر حکومت کا کوئی کردار نہیں ہے بلکہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کے حوالے سے آزاد کشمیر کے آئین کی دفعہ 31(3) کے تحت خصوصی پابندی ہے۔اگر مقصد یہ تھا تو اس کو وزیر اعظم پاکستان کا کشمیر کے حوالے سے خصوصی نمائندہ مقرر کیا جاتا جو کام بھی کر سکتا۔آزاد کشمیر کا صدر اور وہ بھی حکومت پاکستان کا سابق ملازم، پھر بھی حکومت پاکستان کا ہی محتاج اور اسی کی وساطت سے تحریر و تقریر کر سکتا ہے۔

آزاد کشمیر میں صدر یا وزیر اعظم مرکزی حکومت اور اداروں کے نامزد لوگ ہی بنتے ہیں جن کی رسمی کارروائی اسمبلی سے کرائی جاتی ہے یہ سلسلہ 1950 سے آج تک جاری ہے۔شروع میں منسٹری کشمیر کی منظور شدہ مسلم کانفرنس کا نمائندہ صدر نامزد کیا جاتا رہا ہے۔اس کے بعد حاضر سروس بریگیڈیئر/ جنرل عبدالرحمان اور حیات خان، 1985 کے الیکشن کے بعد پارلیمانی پارٹی کی اکثریت سردار عبدالقیوم کے وزیر اعظم بننے کے حق میں تھی لیکن سردار سکندر حیات کو وزیر اعظم منتخب کرایا گیا، 1992 میں سردار عبدالقیوم کو جبکہ 1996 میں پارلیمانی پارٹی کی اکثریت سردار ابراہیم خان کو وزیر اعظم بنانا چاہتی تھی لیکن چوہدری سلطان محمود کو بنوایا گیا، 2001 میں پارلیمانی پارٹی کی اکثریت سردار عتیق خان کو وزیر اعظم بنانے کے حق میں تھی لیکن سردار سکندر حیات خان کو بنوایا گیا جبکہ حاضر سروس جنرل، انور خان کو قانون میں خصوصی ترمیم کر کے صدر بنوایا گیا۔اسی طرح 2006 کی اسمبلی کی پارلیمانی پارٹی سردار سکندر کو وزیر اعظم بنانا چاہتی تھی لیکن سردار عتیق خان کو وزیر اعظم اور راجہ ذوالقرنین کو صدر اور 2011 کی اسمبلی کی پارلیمانی پارٹی میں پہلی بار پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت نے ہی، لیکن مقامی ورکرز چوہدری عبدالمجید کو وزیر اعظم اور ایک بے نام و نمود کارکن سردار یعقوب خان کو صدر بنوایا جس کے پس پردہ بے

شمار کہانیاں منسوب ہیں۔ یہ روایت 2016 کے الیکشن میں بھی بحال رہی۔ کشمیر کے مسئلہ کے حل نہ ہونے کی سزا آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے لوگ خواہ مخواہ بھگت رہے ہیں جو بلاشبہ پاکستان میں ہیں، لیکن ان کو جمہوریت کے نام پر مرکزی سیاسی اور بیوروکریسی کی لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہے۔ جس سے نئی نسل بیزار اور تیسری آپشن کے حق میں ہوتی جا رہی ہے۔

گلگت بلتستان میں حکومتوں کی تشکیل و تحلیل

1947 سے پہلے گلگت بلتستان جو اب پاکستان میں ہیں اور کارگل اور لداخ جو ہندوستان میں ہیں، ریاست جموں وکشمیر کا عملی طور پر تیسرا صوبہ تھے جن کو Frontier Districts کہا جاتا تھا، یہ چھوٹے چھوٹے راجواڑوں کے زیر تسلط تھے جن کی سرحدیں چین، روس، افغانستان اور ہندوستان سے ملتی تھیں۔ ان علاقوں کی اہمیت کے پیش نظر ہندوستان کی نظریں ان پر لگی ہوئی تھیں۔

پنجاب کے سکھ اور جموں وکشمیر کی ڈوگرہ حکومتوں نے ان میں سے متعدد علاقوں کو 1840 سے 1890 تک اپنے زیر تسلط میں لے لیا اور اس کے بعد برطانوی فوج کی مدد سے 92-1891 میں مختلف علاقوں پر فتح حاصل کر کے ان علاقوں کو اپنے کنٹرول میں کر کے 1935 تک انگریزوں نے ان علاقوں کو گلگت ایجنسی بنا کر گلگت، لداخ، سکردو اور کارگل کے یونٹس میں تقسیم کر دیا۔ ان علاقوں کا اندرونی کنٹرول حکومت ریاست جموں وکشمیر، جبکہ بیرونی معاملات برطانوی حکومت کے پاس رہے۔

ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی یہاں کے مقامی لوگوں نے مقامی سکاؤٹس کی مدد سے مہاراجہ کشمیر کی فوج سے آزاد کروا کر گلگت میں یکم نومبر 1947 کو شاہ رئیس خان کی سربراہی میں ان علاقوں میں ایک عبوری حکومت قائم کی اور انگریز فوج کے میجر براؤن کی قیادت میں مہاراجہ کشمیر کے گورنر گھنسارہ سنگھ کو حفاظتی تحویل میں لے لیا۔ اس علاقے کے مقامی راجوں اور میروں نے الگ الگ دستاویزات کے ذریعہ اپنے کنٹرول میں علاقوں کا الحاق پاکستان سے کر دیا۔ لیکن سلامتی کونسل کی قراردادوں کی وجہ سے پاکستان نے وہ الحاق نامے آج تک منظور نہیں کیے تاہم ان علاقوں کا

کنٹرول براہ راست سنبھال لیا ہے جو اس وقت تک مقامی حکومت کے ذریعہ حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر و گلگت بلتستان کے کنٹرول میں ہیں۔ حکومت آزاد کشمیر اور حکومت پاکستان کے درمیان 1949 کو کراچی معاہدے کے نام سے ایک معاہدے کے تحت شمالی علاقوں کے انتظام وانصرام پر حکومت پاکستان کا حق تسلیم کیا گیا۔ یہ دستاویز اشک شوئی کے مترادف ہے۔ کیوں کہ ان علاقوں کا کنٹرول ہمیشہ سے حکومت پاکستان کے پاس چلا آ رہا تھا جہاں 15 نومبر 1947 کو اس کا نمائندہ مقرر کیا گیا تھا۔ تاہم اس معاہدے کی وجہ سے یہ علاقے ریاست کے ساتھ غیر مبہم طور تسلیم اور منسلک کیے گئے اور ان علاقوں کے راجوں اور میروں کے الحاق نامے معرض التوا میں رہ گئے۔

اس کا کُل رقبہ 27946 مربع میل ہے اس وقت تک گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کو باضابطہ طور پر پاکستان کے آئین میں صوبے یا حصے کے طور شامل نہیں کیا گیا لیکن دونوں علاقوں کو صوبے کے طور چلایا جا رہا ہے۔ دنیا کا سب سے اونچا اور بڑا میدان جنگ سیاہ چین، بلند ترین اور سب سے بڑا غیر آباد میدان دیوسائی کے علاوہ دنیا کی چار بلند ترین چوٹیاں ان علاقوں میں ہیں۔ چین سے ملانے والی قومی شاہراہِ ریشم بھی اسی علاقے سے گزرتی ہے۔ فی الواقعہ یہی علاقہ پاکستان کی شہ رگ ہے۔ CPEC جیسے دیوہیکل پروجیکٹ کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

گلگت بلتستان میں حکومت پاکستان نے اسلم خان کے نام سے اپنا پہلا نمائندہ 15 نومبر 1947 میں پولیٹکل ایجنٹ کے طور پر مقرر کیا۔ جبکہ 1948 میں گورنر صوبہ سرحد کو ان علاقوں کے لیے گورنر جنرل کا ایجنٹ مقرر کیا گیا جس کو بعد میں پولیٹکل ریزیڈنٹ کے سپرد کیا گیا۔ 1950 میں ان علاقوں کا کنٹرول وزارتِ امورِ کشمیر کے سپرد کیا گیا جس کے اختیارات ریزیڈنٹ استعمال کرتا رہا۔ 1964 کو بلتستان کو گلگت سے الگ کر کے نئی ایجنسی قائم کی گئی۔ 1967 میں ان علاقوں کے لیے ایک ریزیڈنٹ کمشنر مقرر کیا گیا جس کا صدر دفتر گلگت میں تھا۔ بیوروکریسی کے ساتھ عوامی نمائندوں کو شامل کرنے کے لیے 1970 میں براہ راست الیکشن کے ذریعہ ایڈوائزری کونسل قائم کی گئی۔ 1972 میں ان ایجنسیز کو ضلعوں میں تقسیم کیا گیا جبکہ 1974 میں چند دوررس اقدامات اٹھائے گئے جن میں جاگیرداری نظام اور

FCR کا خاتمہ، منتخب مشاورتی کونسل کا قیام شامل ہے۔ Governance Order1970 کے بدلے لیگل فریم ورک آرڈر 1975 نافذ کیا گیا جس کے تحت منسٹر وزارت امور کشمیر کو ان علاقوں کا سیاسی سربراہ مقرر کیا گیا۔ جبکہ علاقے کی منتخب کونسل کو وائس چیئرمین منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا، علاقے کے ریزیڈنٹ کمشنر کو انتظامی سربراہ جبکہ اس کی معاونت کے لیے ایک سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ عدالتی سطح پر ایک جوڈیشل کمشنر کے علاوہ 1979 میں دو ایڈیشنل سیشن جج بھی مقرر کیے گئے۔

1994 میں گورننس آرڈر 1994 نافذ کیا گیا جس کے تحت ان علاقوں میں چند بنیادی اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ اسی قانون کے تحت ناردرن ایریا لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا اور وزیر امورِ کشمیر کو ان علاقوں کا چیف ایگزیکٹو مقرر کیا گیا جبکہ کونسل کے لیے ڈپٹی چیف ایگزیکٹو اور ڈپٹی سپیکر بھی مقرر کیے گئے۔ پہلے منتخب ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو فدا محمد ناشاد مقرر ہوئے۔ اس کونسل کو 49 معاملات پر قانون سازی کا اختیار دیا گیا جو معمولی نوعیت کے مقامی اختیارات تھے جن میں قلیل بجٹ کا احیا بھی شامل تھا۔ عدالتی سطح پر سپریم اپلیٹ کورٹ، چیف کورٹ اور ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے کا قیام عمل میں لایا گیا اور چیف ایگزیکٹو کی معاونت کے لیے دو مشیر بھی مقرر کیے گئے۔ گورننس آرڈر میں وقتاً فوقتاً ترامیم کے ذریعہ مختلف اصلاحات کی گئیں جن میں ناروِرن ایریا کونسل کو قانون ساز اسمبلی بنایا گیا۔ 2007 میں کونسل کے لیے Chief Exectuive کا عہدہ بھی تخلیق کیا گیا جو انتخابات کے ذریعہ پر کیا جا سکتا تھا۔ بجٹ کے اختیارات میں بھی اضافہ کیا گیا۔

2009 میں مزید اور دوررس آئینی اصلاحات عمل میں لائی گئیں اور اس سلسلے میں

Gilgit Baltistan (Empowerment and Self Governance order), 2009 نافذ کیا گیا۔ جس کے تحت ان علاقوں کے لیے حکومتی سیٹ اپ کی طرز پر کونسل، حکومت، سپریم اپیلیٹ کورٹ، چیف کورٹ کے علاوہ قانون سازی کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا۔ منتخب وزیر اعلیٰ اور صدر پاکستان کی جانب سے مقرر شدہ گورنر کے عہدوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس آئینی ڈھانچہ کے تحت ان علاقوں کو صوبائی طرز حکومت کا تاثر دیا گیا جبکہ ایسا ہے نہیں۔ بہ ایں ہمہ یہ ایک انقلابی قدم ہے جس کے تحت ان

علاقے کے لوگوں کو Opening مل گئی۔ اسمبلی کے منتخب ممبران کی تعداد 24 مقرر کی گئی جس کے علاوہ تین ٹیکنوکریٹ اور آٹھ خواتین بھی بالواسطہ منتخب ہو سکتے ہیں۔ یہ بالواسطہ یا نامزد ممبران دراصل حکومتی ممبر ہوتے ہیں جس طرح آزاد کشمیر اسمبلی میں ہیں، جن کے ذریعہ حکومت پاکستان ان علاقوں کی حکومت قابو میں رکھتی ہے۔ اس قانونی دستاویز کے تحت علاقے کے لوگوں کو اسی طرز پر بنیادی حقوق دیئے گئے جو پاکستان کے آئین 1973 میں درج ہیں۔ سپریم اپیلیٹ کورٹ کو بھی سپریم کورٹ پاکستان کی طرز پر اختیارات دیئے گئے۔ یہ قانون یقیناً مکمل غلامی سے نیم آزادی کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ ان اصلاحات کا سہرا جنرل مشرف اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سر ہے۔

341

اس علاقے کی اسمبلی نے اس وقت تک متفقہ طور پر دو قراردادیں پاس کی ہیں جن کے تحت ان علاقوں کو پاکستان کا باضابطہ آئینی صوبہ بنانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ آزاد کشمیر کے لوگوں کے برعکس ان علاقے کے لوگوں کی سیاسی سوچ اور اپروچ بالکل واضح ہے کہ یہ پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں۔ اس قانون کے تحت پاکستان پیپلز پارٹی کے سید مہدی شاہ پہلے منتخب وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں ان علاقوں میں بھی آزاد کشمیر کی طرز پر موجود ہیں۔ جن میں پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ، متحدہ قومی موومنٹ، جمعیت السلام پاکستان، اسمبلی میں سب کی نمائندگی ہے۔ علاقہ کی اکثریت چوں کہ شیعہ مسلمان ہیں اس لیے اسمبلی میں ان ہی کی تعداد زیادہ ہے جبکہ علاقہ دیامر اور چلاس کے سنی مسلمانوں کو اس پر تحفظات ہیں۔ شیعہ بھی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں اسماعیلی، نوربخشی، اثنا عشری ہیں۔ لوگ زیادہ تر بلتی، شینا، کھووار، بروشکی زبان بولتے ہیں۔ چلاسی اور گوجری بھی بولی جاتی ہے۔

قطع نظر صوبہ بنانے کے مطالبے، یا آزاد کشمیر میں شامل کرنے کے، مناسب ہے کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو دو الگ الگ انتظامی یونٹس کے طور سلامتی کونسل کی قراردادوں کے تحت کشمیر کے حتمی حل تک صوبے کے برابر حقوق دیئے جائیں اور اس طرز پر پاکستان کے آئین میں ترمیم کی جائے اس سے ان علاقوں کے لوگوں کو مرکز میں ایک مقام بھی حاصل ہو جائے گا اور کشمیر پر حکومت

پاکستان کے موقف پر بھی آنچ نہیں آئے گی اور تاثر بھی مضبوط ہوگا کہ پاکستان ان علاقوں کو بطور صوبہ پاکستان میں ضم نہیں کر رہی بلکہ ان کو ریاست جموں وکشمیر کا حصہ تسلیم کرتے ہوئے ریاست بھر میں رائے شماری ہونے تک ریاست کے دو الگ الگ انتظامی یونٹس سمجھتی ہے جن کے حقوق پاکستان کے باقی یونٹس کے برابر ہیں۔ اس سے ان علاقوں کی محرومی، پاکستان کا ان علاقوں میں رہنے کا آئینی اور حکومتی جواز پیدا ہوگا۔

320

حصہ سوم

ہندوستانی مقبوضہ کشمیر

ہندوستانی کشمیر میں حکومتوں کی تشکیل وتحلیل

ریاست کا جو حصہ ہندوستان کے زیر کنٹرول ہے، وہ قدیم ایام سے حکومتی سیٹ رہا ہے، بھلے وہ سرینگر ہو یا جموں۔ اس لحاظ سے وہاں حکومتی ڈھانچہ، اس کو چلانے والی مشینری اور قواعد کار وغیرہ موجود تھے۔ 1947 کے ہنگامی حالت کے ساتھ ساتھ مہاراجہ کشمیر نے تقسیم ہند کے بعد زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے 12 اگست 1947 کو ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ معاہدہ جوں کا توں (stand still) کرنے کی پیشکش کی، پاکستان نے تو اس کو قبول کر لیا لیکن ہندوستان نے مقررہ تاریخ تک نہیں کیا۔ 22 اکتوبر 1947 کو پاکستان کے صوبہ سرحد سے قبائل نے مقامی مسلمانوں کی حمایت کے لیے ریاست میں داخل ہونے کو مہاراجہ کشمیر نے پاکستان کی جانب سے ریاست کو زبردستی ہتھیانے کی

341

کوشش قرار دیتے ہوئے 26 اکتوبر 1947 کو ہندوستان کے ساتھ چند امور پر مشروط الحاق کر دیا جسے ہندوستان نے 27 اکتوبر کو تسلیم کر کے اپنی فوجیں کشمیر میں اتار دیں۔

مہاراجہ کشمیر نے شیخ محمد عبداللہ، جو کشمیر کے رہنما تھے، کو جیل سے رہا کر کے 30 اکتوبر 1947 کو کشمیر کی ہنگامی انتظامیہ کا سربراہ بنایا (Emergency Administrator) جبکہ اس کی حکومت کے وزیر اعظم ایم سی مہاجن بھی اپنی جگہ قائم رہے۔ 5 مارچ 1948 کو وزیر اعظم کے سارے حکومتی اختیارات بھی نیشنل کانفرنس کے سپرد کر دیئے گئے جس کے سربراہ شیخ محمد عبداللہ تھے، اس طرح ریاست میں مہاراجہ کے ماتحت مکمل عوامی حکومت قائم ہوگئی جس کے سربراہ شیخ محمد عبداللہ تھے۔ مہاراجہ نے اس سے بہت پہلے ریاستی باشندوں کو حکومتی نظم ونسق میں شامل کرنے کے لیے بہت سی اصلاحات کا عمل شروع کر دیا تھا، لیکن یہ عمل حالات کی نزاکت کے پیش نظر اس کی انتہا تھی۔ شاید مہاراجہ نے بھانپ لیا کہ سارا جاتے دیکھیو تو آدھا دیجیو بانٹ، کے تحت ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ اسی دوران 16 جون 1948 کو ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی نے ریاست کے چار نمائندوں کو اس میں شامل کر لیا اور اس طرح ریاست کو ہندوستانی آئین کے تحت لانے کا عمل شروع ہو گیا۔ اندرون ریاست اختیارات مہاراجہ کے پاس ہی رہے جو 1939 کے آئین کے تحت تھے۔ 20 جون 1949 کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک اعلامیہ کے ذریعہ والئی ریاست کے تمام اختیارات اپنے بیٹے کرن سنگھ کے سپرد کر دیئے اور خود صحت کی خرابی کی بنا پر ریاست چھوڑ گئے۔ یہ ایک بہانہ تھا اصل میں اس کو ہندوستان کی حکومت نے ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا۔ مہاراجہ اس کے بعد 1961 میں وفات تک کشمیر نہیں آیا۔

26 جنوری 1950 کو ہندوستان کا آئین نافذ ہوا، جس کی دفعہ 370 کے تحت ریاست کے انصرام وانتظام کے اصول واضح کیے گئے۔ اسی روز صدارتی حکم کے تحت ریاست کو ہندوستان کا ایک حصہ اور صوبہ قرار دے کر مرکز کے وہ تمام اختیارات جو الحاق نامہ میں درج تھے کے متعلق قوانین اور احکامات کا اطلاق ریاست پر کر دیا۔ ان اختیارات میں دفاع۔ خارجہ اور مواصلات شامل تھے۔ 20 اپریل 1951 کو نئے مہاراجہ کشمیر کرن سنگھ نے ایک حکم نامہ کے ذریعہ ریاست میں نیا آئین بنانے

کے لیے آئین ساز اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا اور اس کے لیے الیکشن 15 اکتوبر 1951 کو منعقد ہوئے جس کے تحت اسمبلی کی 75 نشستوں میں سے 73 نیشنل کانفرنس نے بلا مقابلہ اور 2 مقابلہ کے ذریعہ جیت لیں۔ یہ ریاست میں الیکٹورل دھاندلی کی ابتدا کی انتہا تھی۔ اسمبلی کی اس وقت 100 نشستیں تھیں جن میں 25 پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے حصوں کے لیے مختص ہیں۔ اس دھاندلی کے خلاف کوئی احتجاج نہیں ہوا کیوں کہ شیخ صاحب سخت گیر آدمی تھے لیکن کشمیر کے اس وقت مسلمہ لیڈر بھی تھے۔ اس کے حق میں قبائل کی لوٹ مار کی وجہ سے ہمدردی کی لہر چل نکلی تھی کیوں کہ شیخ صاحب کو اس وقت وادی کے لوگ نجات دہندہ سمجھتے تھے، جب جموں میں قتل عام ہو رہا تھا۔

ریاستی آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس 31 اکتوبر 1951 کو منعقد ہوا جس نے آئین سازی کا عمل 17 نومبر 1956 تک مکمل کر لیا۔ اس آئین کی دفعات 2 تا 8 اور 158 کو جو ریاست کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ قرار دینے کے علاوہ ہندوستان کو کشمیر پر خصوصی اختیارات دیتی ہیں فوری طور پر نافذ ہوئیں جبکہ بقیہ آئین کا نفاذ 26 جنوری 1957 سے ہوا۔ یہی اسمبلی ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے طور بھی کام کرتی رہی اور اسی اسمبلی نے ہندوستانی پارلیمنٹ کے لیے ممبران کا انتخاب کیا کیوں کہ ہندوستان الیکشن کمیشن کا اطلاق کشمیر پر نہیں ہوا تھا۔ ہندوستانی آئین میں دفعہ 370 کے تحت خصوصی ترمیم کے ذریعہ ریاست کی حکومت کو پارلیمنٹ کے لیے ممبران کو نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا جن کو صدر جمہوریہ ہند نے ریاست کی طرف سے پارلیمنٹ کے ممبران کے طور مشتہر کیا۔ یہ سلسلہ 1968 تک چلتا رہا۔

جموں و کشمیر میں اس وقت بھی باقی صوبوں کے برعکس ریاست کا اندرونی نظم و نسق ریاست کے آئین 1957 کے تحت چلایا جا رہا ہے جبکہ مرکزی معاملات ہندوستانی آئین کے تحت چلائے جا رہے ہیں جو صدارتی حکم کے ذریعہ دفعہ 370 کے تحت نافذ کیے جاتے ہیں جس کے لیے پارلیمنٹ آف انڈیا کی توثیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ 1957 میں ریاستی آئین کے نفاذ تک ریاست کا نظم و نسق 1939 کے آئین میں متعدد ترامیم کے تحت چلایا جاتا رہا۔ اس میں اہم ترین ترمیم ڈوگرہ خاندان سے حکومت کے خاتمہ کی تھی جس نے کشمیر پر ایک سو سال تک حکومت کی تھی۔ مہاراجہ وراثت کی بجائے

ریاست میں منتخب صدر ریاست قرار پایا۔ چنانچہ ریاست کے پہلے صدر مہاراجہ کرن سنگھ بنے۔ شیخ محمد عبداللہ نے 1950 میں انقلابی قانون کے تحت ریاست سے جاگیرداری نظام ختم کر کے زمین ان کے قابضین کو بلا معاوضہ تقسیم کر دی۔ اسی عرصے میں مشہور دہلی ایگریمنٹ جولائی 1952 میں مابین شیخ عبداللہ اور پنڈت جواہر لال نہرو وجود میں آیا جو دراصل دفعہ 370 کی تکمیل کی طرف ایک قدم تھا۔ 14 نومبر 1952 کو باقی ہندوستانی ریاستوں کی طرح ریاستی آئین ساز اسمبلی نے مہاراجہ کشمیر کی موروثی حکومت ختم کر کے کرن سنگھ کو صدر ریاست منتخب کیا جس کی جن سنگھ اور دیگر ہندو قوم پرست جماعتوں نے شدید مزاحمت کی۔

اس کے بعد شیخ عبداللہ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوتے گئے کیوں کہ دہلی نے شیخ عبداللہ کی بین الاقوامی سرگرمیوں کو پسند نہیں کیا۔ ان میں الجیریا میں، چواین لائی سے ملاقات شامل تھی۔ اس وجہ سے 9 اگست 1953 کو شیخ محمد عبداللہ کو مہاراجہ کرن سنگھ نے وزارت عظمیٰ سے برطرف کر کے اس کے نائب وزیر اعظم بخشی غلام محمد کو کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ شیخ محمد عبداللہ کے رفیق کار مرزا افضل بیگ نے 9 اگست 1955 نیشنل کانفرنس کو ختم کر کے محاذ رائے شماری کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت کشمیر میں رائے شماری کا مطالبہ جاری رکھا۔ آزاد کشمیر میں اسی کی شاخ کی بنیاد عبدالخالق انصاری مرحوم اور اس کے ساتھیوں مقبول بٹ شہید، امان اللہ خان مرحوم وغیرہ نے اپریل 1965 میں ڈالی۔ اس کے کارکنوں کے ساتھ کشمیر کے دونوں حصوں میں ایک جیسا برتاؤ کیا جاتا رہا۔

جون 1954 میں ہندوستان نے کشمیر میں دفعہ 370 کے تحت دوسرا آئینی حکمنامہ جاری کر کے ہندوستانی آئین کی متعدد دفعات کا ریاست پر اطلاق کیا اور ریاست کو ہندوستان کے مکمل قبضے میں کرنے کے لیے پنجے گاڑ لیے۔ اب ہندوستان نے سلامتی کونسل کی قراردادوں اور اس کے لیڈروں کے ساتھ وعدے وعید سے منہ موڑ لیا اور ریاست کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ قرار دینا شروع کر دیا۔ 1961 میں لداخ میں چین کے ساتھ جنگ میں ہندوستان کو یقین تھا کہ پاکستان کشمیر پر حملہ کر کے کشمیر کو آزاد کرا لے گا لیکن پاکستان امریکہ اور ہندوستانی ڈپلومیسی کے ہاتھوں مار کھا گیا اور یہ نادر

موقع ضائع کر دیا۔

1957 میں ریاستی الیکشن کمیشن نے دوسرے الیکشن ریاست کے 1957 کے آئین کے تحت منعقد ہوئے جس میں بخشی غلام محمد وزیر اعظم کی جماعت نے 75 میں سے 68 نشستیں حاصل کیں۔ ان میں نصف سے زیادہ بلا مقابلہ تھیں۔ بخشی غلام محمد وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

1962 میں شیخ محمد عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری کے بعد اسمبلی کے الیکشن 1962 میں ہی منعقد ہوئے جن میں بخشی غلام محمد کی نیشنل کانفرنس نے 75 میں سے 70 نشستیں حاصل کر کے بخشی غلام محمد کشمیر کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اس الیکشن میں ہندو بنیاد پرست پارٹی پرجا پریشد نے 3 اور آزاد امیدواروں نے 2 نشستیں حاصل کیں۔

27 دسمبر 1963 کو درگاہ حضرت بلؒ سے حضور نبی کریم ﷺ کے موئے مقدس کی چوری کی وجہ سے کشمیر میں سیاسی طوفان برپا ہو گیا اور ہندوستان کشمیر میں تقریباً بے بس ہو گیا۔ سردھڑ کی کوشش کر کے 4 جنوری 1964 کو موئے مقدس کو بازیاب کیا گیا۔ جون 1964 میں میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق نے عوامی ایکشن کمیٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس کے تحت موئے مقدس کی بازیابی کی تحریک چلائی گئی۔ اس دوران بخشی غلام محمد سے استعفیٰ لے کر 12 اکتوبر 1963 کو شمس الدین کو کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اس کی جگہ 29 فروری 1964 کو غلام محمد صادق کو انڈین کانگرس پارٹی کی طرف سے وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ جنہوں نے بعد میں کشمیر میں کانگریس کی بنیاد ڈالی۔

اسی دوران 1965 میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعہ کشمیر میں وزیر اعظم اور صدر ریاست کے ناموں کو وزیر اعلیٰ اور گورنر کے ناموں میں بدل دیا گیا اور مطابقاً کشمیر کے آئین میں ترمیم کی گئی۔ عہدے ریاستی آئین کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں براہِ راست الیکشن کا ترمیمی حکم بھی جاری کیا گیا۔ جو ہندوستانی آئین کے ایک حکم نامے کے ذریعہ کیا گیا۔ غلام محمد صادق کا دَور کشمیر کی تاریخ میں قانون کی حکمرانی اور شخصی آزادی کا بہترین دور تھا لیکن اسی دور میں ہندوستان کو کشمیر میں مکمل طور ضم کرنے کا آغاز ہوا۔ صادق صاحب کشمیر کی خصوصی حیثیت کے حامل نہیں تھے۔

صادق صاحب نے شیخ محمد عبداللہ کے خلاف بغاوت کے مقدمات[341] ختم کیے، شیخ صاحب کو رِہا کیا جس کے بعد شیخ صاحب کی پنڈت نہرو سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پنڈت نہرو نے شیخ صاحب کو پاکستان کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ بات چیت کے ذریعہ حل کرنے کے لیے پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا جس کا پاکستان نے خیر مقدم کیا بلکہ 25 مئی 1964 کو خصوصی طیارہ دہلی بھیج کر شیخ صاحب کو پاکستان لایا جن کے ساتھ دیگر کشمیری لیڈر اور ہندوستانی صحافی تھے۔ بدقسمتی سے اس دوران پنڈت نہرو 27 مئی کو وفات پا گئے اور یہ مشن ناکام ہو گیا۔ اس مشن کے نتیجے میں جون 1964 کو پنڈت نہرو اور جنرل ایوب خان کی دہلی میں ملاقات ہونی تھی۔

وادی میں موئے مقدس کے چرائے جانے کی طوفانی سیاسی ہلچل کا فائدہ اٹھانے کے لیے پاکستان نے 1965 میں آپریشن جبرالٹر کے نام سے ہندوستانی کشمیر میں فوجیوں کو مجاہدین کا نام دے کر داخل کیا جن میں زیادہ تر ریاست کے دونوں حصوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ ان میں ریاست سے تعلق رکھنے والے پاکستانی فوجی بھی شامل تھے۔ میں اس وقت بارہ مولہ کالج میں زیر تعلیم اور بڈگام میں این سی سی کیمپ میں زیر تربیت تھا۔ ہم نے کئی مجاہدین سرینگر شہر اور بڈگام میں دیکھے اور ان سے مل کر بہت خوشی محسوس کی۔ بدقسمتی سے پاکستان نے 1947 کی طرح ہی اس وقت بھی مقامی قیادت کو اعتماد میں نہیں لیا تھا، وگرنہ ان مجاہدین کو قطعاً ناکامی نہ ہوتی اور جو الزامات کشمیریوں پر لگائے گئے، وہ کبھی نہ لگائے جاتے۔ بین الاقوامی دباؤ کے تحت ان لوگوں کو واپس بلایا گیا لیکن جموں میں مسلم اکثریت کے جن علاقے کے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا تھا، ہندوستانی فوج نے ان پر قیامت برپا کر دی۔ سجاد حیدر جو پاکستان فضائیہ کے ریٹائرڈ آفیسر ہیں، نے اپنی کتاب Flight of the Falcon کے تیسرے ایڈیشن میں لکھا ہے:

"This maniac plan had been executed without any known covert net working with Kashmiri dissidents and potential leaders who could have given some substance to the plan which is an indispensable lynchpin for success of

insurgency. Truly speaking, operation Gibralter was a classic in immature military and bureaucratic planning which was tantamount a cruel joke on the Pakistani nation."

اس کے ساتھ ہی 1965 میں ہندوستان اور پاکستان میں باضابطہ جنگ بھی شروع ہوگئی، لیکن بین الاقوامی دباؤ کے تحت 23 ستمبر کو دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بندی عمل میں آ گئی جس کے بعد 10 جنوری 1966 میں روس کے شہر تاشقند میں ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادری شاستری اور صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خان کے درمیان تاشقند معاہدہ طے پایا کہ دونوں ملکوں کی فوجیں 1965 کی جنگ سے پہلی والی پوزیشن پر واپس جائیں گی۔

1967 میں کشمیر اسمبلی کے الیکشن انڈین الیکشن کمیشن کے تحت منعقد ہوئے جن میں نیشنل کانگرس نے بھی حصہ لیا۔ ان الیکشنز کے نتیجہ میں کانگرس نے 61 نشستیں حاصل کیں جن میں اکثر بلا مقابلہ تھیں۔ شیخ محمد عبداللہ کی محاذ رائے شماری نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا۔ بخشی غلام محمد کی نیشنل کانفرنس کے 8، جن سنگھ نے 3 اور 3 آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔ کانگریس کے صدر محمد صادق مرحوم کو کشمیر کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ صادق صاحب ہندوستانی حکومت کے کشمیر میں سب سے زیادہ معتمد آدمی تھے اور اندرا گاندھی کے قریب ترین مشیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ موصوف 12 دسمبر 1971 کو بحیثیت چیف منسٹر ہی چندی گڑھ کے ایک ہسپتال میں وفات پا گئے۔

1965 کی گوریلا جنگ کی وجہ سے کشمیر میں گوریلا سرگرمیوں کو شہہ ملی۔ امان اللہ خان اور محمد مقبول بٹ نے محاذ رائے شماری کے ساتھ عسکری محاذ پر جموں و کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کے نام سے تنظیم بنائی تا کہ ہندوستان سے کشمیر کو آزاد کرایا جا سکے۔ ان کی سرگرمیاں جاری رہیں لیکن ہندوستانی کشمیر میں پاکستان دراندازی کا بدلہ لینے کے لیے مشرقی پاکستان میں اپنا دائرہ وسیع کر کے پاکستان کے دونوں حصوں میں کشیدگی ہی نہیں بلکہ جنگی صورتِ حال تک حالات پیدا کر دیئے۔ اس کو اس وقت شہ مل گئی جب پاکستانی افواج کے جنرل یحییٰ اور ذوالفقار علی بھٹو کی ملی بھگت سے مشرقی پاکستان سے

1970 کے الیکشن میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعت عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمان کو اقتدار نہ سونپا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں قتل غارت شروع ہوگئی جس کی وجہ سے ہزاروں بنگالی ہندوستان میں داخل ہوئے یا کروائے گئے۔ نریندر مودی ہندوستان کے وزیر اعظم نے ڈھاکہ میں اس مداخلت کو واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ ہندوستان نے مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں اور بالآخر پاکستانی افواج نے 16 دسمبر 1971 کو ہندوستانی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر تحریری طور پر اپنی شکست تسلیم کر لی۔ اس سے پہلے پوری ہند پاک سرحد اور جنگ بندی لائن پر جنگی کیفیت طاری تھی۔ بارہمولہ کے مختلف حصوں میں منصوبہ بند طریقے سے آتش زنی کی وارداتیں ہوتی تھیں جن میں ہندوستان کی بارڈر سکیوریٹی فورسز کے لوگ شامل تھے۔ کئی جگہوں پر یہ لوگ پکڑے بھی گئے لیکن پُر اسرار طریقہ سے رِہا کیے جاتے رہے۔ یہ کارروائیاں ہندوستانی ایجنسیاں مشرقی پاکستان میں جنگ کی صورت میں، خوف و ہراس پھیلانے کے لیے کر رہی تھیں تا کہ اس کا ردِعمل کشمیر میں نہ ہو۔

سقوط ڈھاکہ کا دن کشمیر کے لوگوں کے لیے ماتم کا دن تھا۔ کشمیر کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق جو عارضہ قلب میں مبتلا تھے، ہارٹ اٹیک کی وجہ سے مر گئے کشمیر میں ہندوستانی فوجیں اور ہندو جشن اور مسلمان شامِ غریباں منا رہے تھے۔ میں ان دنوں کپواڑہ میں وکالت کرتا تھا اور اسی دن عبدالغنی لون مرحوم کے ساتھ کرناہ سے سرینگر کے سفر پر رواں تھا جہاں اگلے روز میں نے ہائی کورٹ میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتاری سے بچنے کے لیے ضمانت قبل از گرفتاری کرائی کیوں کہ ہندو پاک جنگ کے دوران انتظامیہ کو میری پاکستان کے حق میں اور ہندوستانی فوجوں کے خلاف سرگرمیوں سے شکایت تھی۔ کشمیریوں نے حوصلے ہار دیئے اور سچی بات ہے کہ 1962 کی چین بھارت جنگ اور سقوط ڈھاکہ کے دن کے بعد پاکستان کا کشمیر کو حاصل کرنے کا خواب بظاہر بلاتعبیر ہو گیا ہے۔ اس جا نکاہ حادثہ کے بعد کئی دن تک کشمیر بھر میں سوگ کا عالم رہا۔ سڑکوں اور دفتروں میں ہو کا عالم تھا۔ ہندوستانی فوجوں اور کشمیر پنڈتوں کے حوصلے بلند اور خوشی کے مارے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔

اس جنگ کے پس منظر میں ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم محترمہ اندرا گاندھی

اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان شملہ ہندوستان میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ مشرقی پاکستان/ بنگلہ دیش میں پاکستان کے 95 ہزار فوجی وغیرہ جنگی قیدی بنائے گئے تھے۔ دونوں وزرائے اعظم کے درمیان 2 جولائی 1972 کو مستقل امن اور تعلقات کو قائم کرنے، جنگی قیدیوں کو واپس کرنے، کشمیر کے مسئلہ کا بات چیت کے ذریعہ حتمی حل، سفارتی تعلقات قائم کرنے، کشمیر میں 1971 کی جنگ کے نتیجے میں قائم ہونے والی جنگ بندی لائن کو ''لائن آف کنٹرول'' بنانے کا معاہدہ طے پایا جو ''شملہ معاہدہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد ہندوستان نے کشمیر پر سلامتی کونسل کی قراردادوں کے تحت اقوام متحدہ کے فوجی مبصروں کو ماننے سے انکار کر کے کشمیر کو دوطرفہ مسئلہ قرار دے کر مکمل فرار حاصل کرلیا۔ پنڈت ڈی پی دھر جو اندرا گاندھی کے ناک کے بال اور شملہ معاہدے کے معماروں میں شامل تھے، اس کے بعد ایک نجی محفل میں ہمیں بتایا کہ بھٹو صاحب نے لائن آف کنٹرول کے ساتھ یہ اقرار کیا تھا کہ یہی کشمیر کا حتمی حل ہے، یہی بات ہندوستانی مصنف Adita Sinha نے اپنی کتاب "Abdullah, Kashmiris prodigal son" کے صفحات 87-85 میں یوسف بچھ کے حوالے سے لکھی ہے۔ جو بھٹو مرحوم کا قریبی ترین دوست اور مشیر بھی رہا ہے۔

اس کے بعد کشمیر میں 1972 کے اسمبلی الیکشن منعقد ہوئے جن میں انڈین نیشنل کانگریس کے سید میر قاسم کی قیادت میں 58، جن سنگھ نے 3، جماعت اسلامی، جو پہلی بار الیکشن میں شامل ہوئی، کے 5 جبکہ 9 آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔ سید میر قاسم وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس دوران شیخ محمد عبداللہ اور اندرا گاندھی کے درمیان 24 فروری 1975 کو مفاہمت ہوئی، جو اندرا عبداللہ ایکارڈ کے نام سے جانی جاتی ہے اس کے نتیجے میں سید میر قاسم، شیخ عبداللہ کے حق میں حکومت سے دستبردار ہوئے اور شیخ محمد عبداللہ 25 فروری 1975 کو کشمیر کے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی کال پر اندرا عبداللہ معاہدہ کے خلاف کشمیر بھر میں 28 فروری 1975 کو کشمیر کے طول وعرض میں مکمل شٹر ڈاؤن کر کے لوگوں نے اس معاہدے کو مسترد کیا۔ اس دن کشمیر میں قبرستان جیسا سکوت طاری ہوگیا تھا۔ 26 مارچ 1977 کو کانگریس نے شیخ محمد عبداللہ کو دیا ہوا اعتماد واپس لے لیا۔ اس کے بعد کشمیر

میں گورنر راج نافذ کیا گیا جو 26 مارچ 1977 سے جولائی 1977 تک جاری رہا۔

اس دوران 30 جون 1977 کو کشمیر میں اسمبلی کے دوبارہ الیکشن منعقد ہوئے جن میں شیخ محمد عبداللہ کی نیشنل کانفرنس نے بھرپور اکثریت حاصل کی اور شیخ محمد عبداللہ مرحوم کو 9 جولائی 1997 کو وزیر اعلیٰ منتخب کیا۔ اس الیکشن میں شیخ صاحب کی نیشنل کانفرنس نے 47، کانگریس نے 11، جنتا پارٹی نے 13 نشستیں حاصل کیں۔ شیخ صاحب 1971 میں مشرقی پاکستان میں پاکستان کے جنگ ہارنے کی وجہ سے کشمیر کے مسئلہ کے حل سے مکمل طور مایوس ہو گئے تھے جس وجہ سے انہوں نے دوبارہ ہندوستان کے ساتھ معاہدہ کر کے کشمیر کی سیاست میں عملی حصہ لینا مناسب سمجھا۔ اور یہ وراثت اپنی نسلوں میں منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

شیخ صاحب 8 ستمبر 1982 کو وفات پا گئے جس کے بعد ان کا بیٹا فاروق عبداللہ کشمیر کا وزیر اعلیٰ منتخب ہوا۔ فاروق عبداللہ نے ریاستی اسمبلی کے چھٹے الیکشن 1983 میں کروائے جس میں نیشنل کانفرنس نے 46، کانگرس نے 26 نشستیں حاصل کیں اور فاروق عبداللہ وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ لیکن اس کا بہنوئی غلام محمد شاہ نے کانگرس کی مدد سے اس کو عدم اعتماد کے ووٹ کے ذریعہ برطرف کر کہ خود وزیر اعلیٰ منتخب ہوا جو جولائی 1984 سے مارچ 1986 تک اس عہدے پر فائز رہا۔ کانگرس کا حکومت کو اعتماد کا ووٹ واپس لینے کی وجہ سے غلام محمد شاہ کی حکومت ختم ہوگئی اور مارچ 1986 سے 7 نومبر 1986 تک ریاست گورنر راج میں چلی گئی۔ جس کے بعد فاروق عبداللہ نے اسمبلی کی بقیہ مدت کے لیے دوبارہ حکومت سنبھالی۔ مرکزی حکومت بالخصوص کانگرس جس طریقے سے کشمیر کی حکومتیں بناتی اور گراتی رہی، اس سے کشمیریوں کے دلوں میں نفرت بڑھتی رہی۔ کانگرس نے 1952 اور 1975 کے معاہدوں کے باوجود کشمیر کی حکومت پر شب خون مارا۔

23 مارچ 1987 کو ریاست کشمیر کی تاریخ کے سب سے زیادہ متنازع (ساتویں اسمبلی) انتخابات ہوئے جس میں انڈین نیشنل کانگرس، نیشنل کانفرنس اور مولانا محمد فاروق کی عوامی ایکشن کمیٹی کے اتحاد نے مل کر الیکشن لڑے جبکہ بالمقابل مسلم متحدہ محاذ (MUF) آزادی پسند اور مذہبی جماعتوں

کا اتحاد تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی بھر کے حریف شیخ اور میر واعظ خاندان آپس میں شیر وشکر ہو گئے اور وہ بھی کانگریس کے زیر سایہ۔ ان کے اس اتحاد کو کشمیر میں ''ڈبل فاروق'' اتحاد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس اتحاد کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرینگر شہر میں ''میر واعظ'' اور شیخ عبداللہ کے حامیوں کے درمیان چپقلش ختم ہوگئی اور شہر اس جنگ وجدل سے بچ گیا جس نے 50 سال سے شیر، بکرہ کی جنگ نے گھیر رکھا تھا۔ مرکزی اور ریاستی مشینری نے مل کر مبینہ طور پر اپنے حق میں نتائج حاصل کرنے کے لیے دھاندلی کی انتہا کر دی جس کے نتیجے میں نیشنل کانفرنس نے 40 کانگرس نے 26، بی جے پی نے 2، جبکہ مسلم متحدہ محاذ کو صرف 4 نشستیں مل سکیں حالاں کہ ان کو ڈالے گئے کل ووٹس کا 31% حصہ تھا۔ اس نے عمومی تاثر قائم کر دیا کہ الیکشن میں شدید دھاندلی ہوئی اور مرکزی وریاستی حکومتوں نے مل کر لوگوں کا حق رائے دہی چرایا جس نے سارے نظام کو مشکوک اور کشمیر ویلی کے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات پختہ کر دی کہ ان کے حقوق پر مسلسل ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے جس وجہ سے نوجوان میدان میں آ گئے اور اس الیکشن کے خلاف شدید مزاحمت، احتجاج جلسے جلوس اور مظاہرے شروع کیے گئے جس نے آزادی کی مسلح تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

کشمیر میں 1987 کے الیکشن اور عسکریت

1987 کے الیکشن کے غیر متوقع نتائج نے کشمیر میں عسکری مزاحمت کی بنیاد ڈال دی۔ اس میں کشمیر کے دونوں حصوں کے لوگ شامل ہو گئے۔ کشمیر کی تاریخ کا یہ ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ فاروق عبداللہ کی حکومت بے بس ہوگئی۔ آزادی پسند یا علیحدگی پسند قوتیں مضبوط ہوتی گئیں۔ ان لوگوں کا آزاد کشمیر میں داخلہ شروع ہو گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے۔ نہ معلوم ہندوستان کی افواج نے ان کو کسی سازش سے آنے دیا، ان کی غفلت اور لاپرواہی سے ایسا ہوا یا اس میں ان کی ملی بھگت تھی۔ ہندوستان کا پریس، آئی بی اور کشمیر کی پولیس اس کو فوج کی ملی بھگت قرار دیتی ہے۔ یہ لوگ چند دن یا چند ماہ کی ٹریننگ لے کر معہ اسلحہ واپس وادی میں داخل ہوتے جہاں جائز و ناجائز کام کرتے

تھے۔ روس کے خلاف افغانی جہاد میں شامل لوگ روس کے نکلنے کے بعد بے روزگار ہو گئے تھے، امریکہ کا کام مکمل ہو گیا تھا، لیکن ان کو تیار کرنے والی نرسریوں میں اُگنے والے پودے پاکستان میں اگتے رہے۔ ان کو کشمیر میں روزگار کے نئے مواقع مل گئے جنہوں نے ہندوستان پاکستان کو جنگ کے دہانے پر اور کشمیر کی نوجوان نسل کو قبرستانوں میں پہنچانا شروع کر دیا۔

اگر ہندوستان نے 1987 میں کشمیر میں انتخابات میں فاروق عبداللہ کے لیے دھاندلی نہ کروائی ہوتی تو وہ سب کچھ نہ ہوتا جو کشمیر اور ہندوستان و پاکستان میں ہو رہا ہے۔ نہ تو حریت کانفرنس کا کوئی وجود ہوتا اور نہ ہی بھانت بھانت کے فرضی اور اصلی ناموں سے عسکری یا جہادی تنظیمیں۔ اگر ہندوستان اور پاکستان نے مل کر کشمیر کا معاملہ سلجھا لیا ہوتا تو برصغیر میں کوئی وجہ مخاصمت نہ ہوتی۔ اس تحریک کے دوران ہزاروں لوگ بے گناہ مارے گئے۔ اربوں، کھربوں کے کاروبار اور املاک کا نقصان ہوا۔ کشمیر کے قدیمی اور اصلی باشندے کشمیر پنڈت وطن چھوڑنے یا چھڑوانے پر مجبور کیے گئے۔ بڑے بڑے لیڈر، وکیل، ڈاکٹر، سیاسی کارکن بلاتخصیص مذہب قتل کیے گئے۔ اس عرصہ میں فاروق عبداللہ کی حکومت نے مرکز کی مدد سے تحریک کو ختم کرنے کے لیے نسل کشی شروع کر دی۔

ہندوستانی فوج کی کشمیریوں پر بے رحم ظلم کی ابتدا 1980 میں ہوئی تھی جب سرینگر شہر میں جولائی کے مہینے میں فوج نے بے لگام ہو کر بلاتخصیص مار پیٹ، مار دھاڑ کی اور شہر میں وحشی درندوں کی طرح لوگوں کو روند ڈالا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بٹ مالو میں فوج نے بازار کو جلایا جس کے خلاف عوامی ردِ عمل کے طور فوجیوں پر حملے ہوئے۔ اس کے جواب میں مختلف چھاؤنیوں سے فوج نے حملے کیے۔ اس کے بعد لوگوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔

جب تحریک کو کنٹرول نہ کیا جا سکا تو حکومت ہندوستان نے کشمیر میں ہندوستان کے بدنام زمانہ شخص، جگ موہن کو 19 جنوری 1990 کو کشمیر کا گورنر مقرر کیا جس پر فاروق عبداللہ نے استعفیٰ دے دیا۔ جگ موہن کو حکومت کے مکمل اختیارات حاصل ہو گئے جبکہ کشمیر کی اسمبلی کو 19 فروری 1990 کو تحلیل کر دیا گیا۔ اس طرح وہ اسمبلی ختم ہوگئی جس کے بنانے میں کشمیر کو جہنم میں جھونکا گیا تھا۔ اس کے

بعد قتل وغارت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو تھمنے میں نہیں آتا۔ جگ موہن نے مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے کشمیری پنڈتوں کا کشمیر سے انخلا کرایا جس سے ہندوستانی فوجوں کو کشمیری مسلمانوں کو قتل کرنے، ان کی تحریک کو فرقہ وارانہ بنوانے اور پاکستان کو بدنام کرنے کا موقع ملا۔ پاکستانی لیڈر شپ اور عوام میں کشمیریوں کی مدد کرنے کے لیے آپس میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ کشمیر سے آنے والوں کو بھرپور معاونت سے نوازا گیا جو ہزاروں کی تعداد میں سرحد پار سے آ رہے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھی کشیدگی انتہا کو پہنچ گئی لیکن عالمی دباؤ کے تحت بات چیت بھی شروع ہو گئی۔ 25 مئی 1990 کو جگ موہن نے استعفیٰ دے دیا جس کی جگہ جی سی سکسینہ کو گورنر مقرر کیا گیا۔ 19 جولائی 1990 کو براہِ راست صدارتی راج نافذ کیا گیا۔ ہندوستانی حکومت نے کشمیر کی حریت پسند لیڈر شپ کے ساتھ بات چیت کا ڈول بھی ڈالا جس سلسلے میں دہلی میں متعدد ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ہندوستانی لیڈروں نے کشمیر کے دورے کیے، حالات کا جائزہ لے کر اس کو سنگین قرار دیا اور حل کے لیے مختلف تجاویز بھی دیں لیکن ساتھ ہی تحریک کو کچلنے کے اقدامات بھی جاری رکھے۔

12 مارچ 1993 کو کشمیر کی سیاسی، سماجی، اور مذہبی تنظیموں نے آل پارٹیز حریت کانفرنس کے نام سے تحریک کو سیاسی پلیٹ فارم مہیا کیا جس کے تحت عسکریت کی بجائے سیاسی حکمت عملی اپنانے کا اعادہ کیا گیا۔ اس کے آئین کے تحت حق خودارادیت میں ''کشمیر کی مکمل آزادی اور خودمختاری'' کو بھی شامل کیا گیا۔ پاکستان نے حریت کانفرنس کو کشمیر کی نمائندہ تنظیم مان کر کشمیر کی خودمختاری کو بطور حل تسلیم کر لیا۔ جبکہ اس کا آئینی موقف ریاست کا ہندوستان یا پاکستان سے الحاق ہے۔ بعد ازاں میر واعظ عمر فاروق اور سید علی گیلانی کی قیادت میں حریت کانفرنس دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ عمر فاروق کو اعتدال پسند جبکہ سید علی گیلانی کو انتہا پسند سمجھا جاتا ہے جس کے پاکستانی ہونے کے موقف میں کوئی لچک نہیں ہے۔ مارچ 1993 کو کے وی کرشنا راؤ کو کشمیر کو گورنر مقرر کیا گیا۔ 22 فروری 1994 کو ہندوستانی پارلیمنٹ نے مشترکہ قرارداد پاس کر کے پوری ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان کا صوبہ گردانتے ہوئے پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے حصوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ یہ اس وقت ہوا جب ہندوستان نے باور

کر لیا کہ اب وہ کشمیری تحریک کو دبانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے بعد چند حریت پسند لیڈروں اور مجاہدین نے بھی پاکستان سے واپس کشمیر جانا شروع کر دیا جن میں اعظم انقلابی، غلام قادر وانی بھی شامل ہیں، جو کشمیر کی تحریک کے بڑے نام تھے۔

حالات کے تناظر میں ہندوستانی حد بندی کمیشن نے کشمیر میں اسمبلی اراکین کی تعداد کو 76 سے بڑھا کر 87 کر دیا جن پر الیکشن ہوتے ہیں جبکہ کل تعداد 111 مقرر کی گئی جن میں سے 24 علامتی طور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے حصوں کے لیے خالی رکھی گئی ہیں۔ کشمیر اسمبلی کی مدت چھے سال ہے۔ یہ اسمبلی کے لیے الیکشن کی تیاری کے سلسلہ میں پہلی کڑی تھی۔ حالات رخ بدلنے لگے اور مین سٹریم سیاسی لیڈروں نے وادی میں اپنی حاضری بھی ڈالنا شروع کر دی۔ 28 اگست 1995 کو لداخ ڈویلپمنٹ کونسل کا الیکشن کرایا گیا۔ 4 نومبر 1995 کو ہندوستان کے وزیر اعظم نرسیماراؤ نے کشمیر کے مسئلہ میں بہت ساری رعایات کا اعلان کیا جو تقریباً نیشنل کانفرنس کے اس مطالبہ سے ملتی جلتی تھیں کہ کشمیر میں 1953 سے پہلے کی آئینی پوزیشن بحال کی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس حد تک کہا کہ ''کشمیر میں ہندوستانی آئین کے اندر خودمختاری کی حد آسمان تک ہے۔'' لیکن حریت کانفرنس کے لیڈر اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے نہ ہی فاروق عبداللہ جس کی جماعت خودمختاری کی دعوے دار چلی آ رہی ہے۔ یہ سب کے لیے بہت مناسب وقت تھا۔ ہندوستانی آئین کی دفعہ 2 اس چیز کی اجازت بھی دیتی ہے اور دفعہ 370 تو اس سلسلے میں کسی حد تک جا سکتا ہے۔ اس کے بعد 17-23 اور 30 مئی 1996 کو تین مرحلوں میں کشمیر میں لوک سبھا کے الیکشن منعقد کیے گئے جن میں نیشنل کانگریس نے 4 جبکہ بی جے پی، جے ڈی نے ایک ایک سیٹ حاصل کی۔

6 جولائی 1996 کو ہندوستانی وزیر اعظم نے کشمیر کا دورہ کیا۔ مسلح تحریک شروع ہونے کے بعد کسی بھی ہندوستانی وزیر اعظم کا یہ پہلا دورہ تھا۔ اس کے بعد 7 تا 30 ستمبر 1996 تک کشمیر اسمبلی کے الیکشن منعقد کیے گئے یہ کشمیر اسمبلی کے آٹھویں جنرل الیکشن تھے، جن میں ویلی کے عام لوگوں نے بائیکاٹ کیا، نیشنل کانفرنس نے 59، بی جے پی نے 8 کانگریس نے 7، جے ڈی 5 اور باقی تین پارٹیوں

نے ایک ایک سیٹ حاصل کی۔ اس الیکشن میں ووٹنگ کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی لیکن ہندوستان نے کشمیر میں جمہوری عمل کی واپسی کا عندیہ دے کر اپنا قد کاٹھ بڑھا لیا۔ 9 اکتوبر 1996 کو فاروق عبداللہ نے 1990 کے بعد پہلی بار پارلیمانی حکومت سنبھالی۔ فروری 1997 کو ہندوستانی وزیر اعظم نے دوسری بار کشمیر اور 27 اپریل کو جموں کا دورہ کیا۔ اس دوران ہندوستان پاکستان کے درمیان اور حریت کانفرنس کے لیڈروں کی بھی دونوں ملکوں کے زعماء کے ساتھ بات چیت ہوتی رہی۔ ہندوستانی وزیر اعظم، صدر اور دیگر مرکزی سرکاری اور غیر سرکاری لیڈروں نے کشمیر کے مسلسل دورے کرنا شروع کر دیئے۔

11 اور 13 مئی 1998 کو ہندوستان نے ایٹمی دھماکے کیے اور اس کے ساتھ ہی سرحدوں پر کشیدگی اور فائرنگ بڑھ گئی لیکن 28 مئی 1998 کو پاکستان کے جوابی ایٹمی دھماکوں سے توازن بحال ہو گیا۔ 7-6 دسمبر 1998 کو ہندوستانی وزیر اعظم نے کشمیر کے تینوں خطوں کا دورہ کیا۔ 11 مئی کو ہندوستانی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے امرتسر سے لاہور بس کا سفر کرتے ہوئے پاکستان کی اہمیت کو تسلیم کر کے نئے باب کا اضافہ کیا لیکن مئی 1999 میں جنرل مشرف نے مہم جوئی کرتے ہوئے کارگل میں خالی ہندوستانی چوکیوں پر قبضہ کر لیا جس وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ 4 جولائی 1999 کو پاکستانی وزیر اعظم کی امریکہ کے صدر کے ساتھ ملاقات کے بعد پاکستان نے کارگل کی چوٹیوں سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔ جنرل مشرف کی اس مہم جوئی نے دنیا بھر میں پاکستان کی بدنامی کرائی اور اعتماد بحال کرنے کی نواز، واجپائی کوشش کو شدید دھچکا دیا۔ پاکستان کے لیے 1971 میں ڈھاکہ کی ہزیمت کے بعد یہ دوسری بڑی رسوائی تھی۔

کشمیر میں عسکری اور حریت کی سیاسی تحریک کے اندر اختلافات، ہندوستانی فوجوں کی کشمیر پر گرفت مضبوط ہونے اور پاکستان کے عالمی دباؤ میں آنے کی وجہ سے کشمیر کے حالات بدلنے شروع ہو گئے۔ ادھر پاکستان میں 12 اکتوبر 1999 کو نواز شریف کو نظر بند کر کے پاکستان کی فوج کے سربراہ جنرل مشرف نے حکومت سنبھال لی اور اس طرح کشمیر کے حوالے سے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ جبکہ امریکہ میں 9 نومبر 2001 کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر حملہ کے بعد دنیا کی تاریخ اور کشمیر میں تحریک کا رخ ہی بدل

گیا۔ اس واقعہ کو 9/11 کے حوالہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس حملے میں ہزاروں بے گناہ مار دیئے گئے۔ مبینہ حملہ آور سب کے سب عرب مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی آزادی کی تحریکیں دہشت گردی کہلانے لگیں اور پاکستان نے بھی ان مجاہدین کو دہشت گرد کہنا شروع کیا جن کی وجہ سے روس کی پسپائی ہوئی تھی۔

بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے!

ہندوستان کی گرفت مضبوط ہونے کے ساتھ ہی کشمیر میں اسمبلی اور لوک سبھا کے الیکشن تواتر کے ساتھ منعقد کروائے جانے لگے۔ کشمیر میں حکومت بھی انڈین نیشنل کانگریس کی اعانت سے نیشنل کانفرنس اور پی ڈی پی بناتی رہی: 2002 کے پی ڈی پی، کانگریس اتحاد اور آزاد ممبران نے حکومت بنائی جس کے سربراہ مفتی محمد سعید مقرر ہوئے۔ 2005 میں، معاہدے کے مطابق، کانگرس کے غلام نبی آزاد کشمیر کے وزیر اعلیٰ بنے۔ اس الیکشن میں کانگریس نے 20 جبکہ نیشنل کانفرنس نے 28 اور پی ڈی پی نے 16 نشستیں حاصل کیں۔ اس حکومت کے دوران امرناتھ شرائن کے نام ہندوؤں کے بسانے کے لیے زمین کی الاٹمنٹ کا قضیہ پیدا ہوا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مفتی سعید کی پی ڈی پی نے اتحاد ختم کیا اور غلام نبی آزاد نے استعفیٰ دے دیا۔

2008 میں ریاستی اسمبلی (دسویں الیکشن) ہوئے جن کے نتیجے میں کانگرس اور نیشنل کانفرنس نے مل کر حکومت بنائی جس کے سربراہ فاروق عبداللہ کے بیٹے، عمر عبداللہ مقرر ہوئے۔ ہندوستان کشمیر میں حکومت بنانے کے لیے ہر وقت متبادل مہرہ تیار رکھتا ہے اور اب کشمیری جماعتوں میں پی ڈی پی کا مضبوط اضافہ ہوا ہے۔ جو نیشنل کانفرنس کے بالمقابل مقامی جماعت بنائی گئی۔ 2008 کے الیکشن میں کانگرس نے 17 نیشنل کانفرنس نے 28 پی ڈی پی نے 21، بی جے پی نے 11 نشستیں حاصل کی تھیں اور باقی دیگر چھوٹی جماعتوں اور آزاد امیدواروں نے لیں جو حکومت میں شامل ہوئیں۔

2014 میں چار مرحلوں میں کشمیر اسمبلی کے گیارہویں الیکشن ہوئے جب مرکز میں بی جے پی کی حکومت تھی۔ اس سے پہلے پارلیمنٹ کے الیکشن میں بی جے پی اور پی ڈی پی نے تین تین نشستیں حاصل کی تھیں۔ اسمبلی کے الیکشن میں پی ڈی پی 28 نشستیں لے کر سب سے بڑی پارٹی بن کر سامنے آئی

جس نے پوری ریاست میں یہ نشستیں حاصل کیں۔ جبکہ بی جے پی 25 نشستیں حاصل کر کے دوسری بڑی پارٹی بن کر سامنے آئی۔ بی جے پی نے صوبہ جموں اور لداخ میں ہی یہ نشستیں لیں وادی میں کوئی نہ لے سکی۔ نیشنل کانفرنس نے 15 اور کانگرس نے 12 نشستیں حاصل کیں جبکہ سجاد لون کی پیپلز کانفرنس اور دوسری چھوٹی جماعتوں اور آزاد امیدواروں نے مل کر 7 نشستیں حاصل کیں۔

کشمیر میں 1987 کے انتخابات کے بعد کے تمام انتخابات میں حریت کانفرنس نے بائیکاٹ کی اپیل کی جس کا شہری علاقوں پر بھرپور اثر ہوا۔ 2014 میں تو لوگوں کی شمولیت کی انتہا تھی جس کا مطلب ہندوستان پر اعتماد نہیں، بلکہ اپنے مسائل کے حل کی تلاش تھی۔ الیکشن کا بائیکاٹ معاملات کا حل نہیں ہے بلکہ اس سے حریت پسند جماعتیں Irrelevent ہو جائیں گی۔ ان کو ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے دوران کانگریس اور مسلم لیگ کے عمل سے سبق سیکھنا چاہیے کہ جنہوں نے آزادی کی جنگ بھی لڑی، الیکشن بھی لڑے، اور آزادی بھی حاصل کی۔

1965 کے بعد سے کشمیر میں ہندوستانی لوک سبھا کے لیے براہ راست الیکشن ہونے لگے اور پہلی بار 1967 کے براہ راست الیکشن میں کانگرس نے کشمیر میں 5، 1971 میں بھی کانگرس نے 5، جبکہ ایک آزاد امیدوار منتخب ہوا۔ 1980 میں نیشنل کانفرنس نے 3 اور کانگرس کے دو الگ الگ دھڑوں نے ایک ایک نشست حاصل کی۔ 2014 کے الیکشن میں بی جے پی اور پی ڈی پی نے تین تین نشستیں حاصل کر کے کانگرس اور نیشنل کانفرنس کا صفایا کر دیا۔

2014 کے اسمبلی الیکشن کے بعد یکم مارچ 2015 کو پی ڈی پی اور بی جے پی کی مخلوط حکومت بنائی گئی جس کے وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید مقرر ہوئے۔ ہندو فرقہ پرست بی جے پی پہلی بار کشمیر کی حکومت میں حصہ دار بنی، گو کہ مفتی سعید صاحب نے معاہدے کے تحت اپنی بہت سی باتیں منوائیں لیکن عمل کسی پر نہ کرا سکے۔ اس کے برعکس ان کے حرص اقتدار نے بی جے پی کو کشمیر میں پاؤں جمانے کا موقع فراہم کیا۔

مفتی محمد سعید صاحب 7 جنوری 2016 کو وفات پا گئے۔ آئینی مدت میں کشمیر میں متبادل حکومت نہ بنائے جانے کی وجہ سے 11 جنوری کو ریاست میں چھٹی بار گورنر راج کا نفاذ کیا گیا۔ 4 اپریل

2016 تک کشمیر میں گورنر راج رہنے کے بعد مفتی محمد سعید مرحوم کی بیٹی محبوبہ[341] مفتی، اور بی جے پی کے درمیان دوبارہ اتحادی حکومت بنی جس کی وزیر اعلیٰ محبوبہ مفتی منتخب ہوئیں جو اس وقت پارلیمنٹ آف انڈیا کی ممبر تھیں لیکن آئین کے تحت چھ ماہ تک بدوں اسمبلی کے ممبر ہونے کے وزیر اعلیٰ بن سکتی تھیں۔ موصوفہ 22/06/2016 کو اننت ناگ کے حلقہ انتخاب سے اسمبلی کی ممبر منتخب ہو گئیں۔

ان کی حکومت کے دوران کشمیر میں ہندوستانی فوجیوں کے لیے ہاؤسنگ کالونیاں اور پنڈتوں کے لیے علیحدہ بستیاں بنانے کی تحریک نے زور پکڑ لیا۔ غیر ریاستی باشندوں کی آبادکاری اور آئین کی دفعہ 370 کے خاتمہ کا آغاز بھی ہو گیا۔ محبوبہ جی بھی اپنے باپ کی طرح پاکستان کے ساتھ تعلقات، تجارت اور ریاست کے دونوں حصوں میں آمدورفت کے لیے مزید روٹس کھولنے کے لیے مستعد ہیں۔ محترمہ کشمیر کی پہلی خاتون اور نویں وزیر اعلیٰ ہیں۔ محترمہ ذاتی طور پر بہت ذہین اور متحرک سیاسی ورکر ہیں لیکن ان کی حکومت میں بی جے پی کی گھاگ قیادت کشمیر میں آبادی کا تناسب مختلف حیلوں بہانوں سے بدلنے میں کمربستہ ہے۔ ان کی حکومت کے دوران ہندوستانی فوجوں نے ریاست میں ظلم کی انتہا کر دی۔

کشمیر میں وقتاً فوقتاً ایسے حادثات ہو جاتے ہیں کہ ہندوستان کے خلاف تحریک یک دم تازہ دم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی حادثہ حزب المجاہدین کے ایک محبوب اور ہر دلعزیز مجاہد برہان وانی کی شہادت سے 2016 میں ہوا۔ تحریک کو دبانے کے لیے چھے ماہ تقریباً کرفیو نافذ رہا، لیکن لوگوں نے بے خوف ہو کر اس کی خلاف ورزی میں وادی بھر میں لاکھوں کی تعداد میں جلسے جلوس کیے جن میں درجنوں لوگ شہید اور ہندوستانی چھرہ گولیوں سے اندھے اور مفلوج ہو گئے اس کے باوجود تحریک میں کوئی کمی نہیں آ رہی۔

ہندوستان کو بالآخر وادی کشمیر کو چھوڑنا پڑے گا لیکن اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کی دشمنی میں اپنے لوگوں کو افلاس اور کشمیر میں نسل کشی کو انتہا پر پہنچا دیں گے۔ زمینی حقائق کا جتنا جلدی ادراک کیا جائے یہ برصغیر اور دنیا کے امن کے مفاد میں ہے۔

حصہ چہارم
کشمیر سے متعلق مفاہمتی عمل

کشمیر سے متعلق ہند پاکستان مفاہمتی عمل اور بین الاقوامی معاہدے

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم ہند کے وقت سے ہی چپقلش، اختلافات اور تنازعات چلے آرہے ہیں یا پھر سامراجی طاقتوں نے پیدا کر کے ان کو شروع دن سے ہی عدم استحکام کا شکار اور ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔ بنیادی تنازع کشمیر کا ہی ہے جس کو برطانوی سامراج نے اس طرح پیدا کر دیا کہ سلجھنے کا نام ہی نہیں لیتا، جس دن یہ معاملہ حل ہوا، اس دن سے برصغیر میں خوش حالی کا دور شروع ہو جائے گا۔

ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کی تخلیق کے بعد اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اور ان سے متعلق کئی معاہدے اور مفاہمتی یادداشتیں اور عمل وجود میں آئے جن میں اکثریت کشمیر کے تنازع سے جڑی ہیں لیکن اس کے حتمی حل کے لیے کیے گئے کسی معاہدے کی تکمیل نہیں ہو سکی۔ معاہدوں اور، مفاہمت کی داستان 1971,1965,1948 کی جنگوں 87-1986 میں لاکھوں ہندوستانی فوجوں کی مشقوں، 1990-1989 میں کشمیر میں ہندوستان کے خلاف مسلح بغاوت، 1999 میں دونوں ملکوں میں ایٹمی دھماکوں اور ہندوستانی پارلیمنٹ پر دسمبر 2001 کو کشمیری مجاہدین کے حملے سے جڑی ہیں۔ کچھ معاہدے تو بین الاقوامی طاقتوں کی مداخلت اور کچھ دونوں ملکوں کی اپنی کوششوں سے عمل میں آئے۔

سلامتی کونسل کے تحت معاہدے

سب سے پہلا معاہدہ سلامتی کونسل کی 21 اپریل 1948 کی قرارداد ہے جس کے تحت مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے ایک کمیشن تشکیل دیا گیا۔ سیکورٹی کونسل اور اس کے مقرر کردہ کمیشن نے 25 قراردادیں پاس کیں لیکن یہ اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوئیں۔ ان قراردادوں کی روشنی میں اقوام متحدہ کے کمیشن نے دونوں ملکوں کے درمیان یکم جنوری 1949 کو جنگ بندی کا معاہدہ کروایا جس کے تحت کشمیر میں تقریباً 800 میل لمبی سرحد کی حد بندی کی گئی جو Cease fire line (CFL) کے نام سے مشہور ہے۔ جس کو شملہ معاہدہ کے بعد Line of Control (LOC) کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد عالمی بینک کی مداخلت سے ان دو ملکوں کے درمیان 1960 میں چھے دریاؤں کی تقسیم کا معاہدہ ہوا جن میں سے تین دریا ستلج، بیاس اور راوی ہندوستان کو دیئے گئے اور تین جہلم، سندھ، اور چناب پاکستان کے حصے میں آئے لیکن ان پر ہندوستان کے بھی کچھ حقوق تسلیم کیے گئے تاہم یہ معاہدہ جوں کا توں قائم ہے۔ یہ سندھ طاس (Indus Water Treaty) کے نام سے مشہور ہے۔

پاک چین سرحدی معاہدہ 1963

2 مارچ 1963 کو پاکستان اور چین کے وزرائے خارجہ کے درمیان ''پاک چین سرحدی معاہدہ'' کے نام سے ایک معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کے کلاز 6 کے تحت پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور چین کے صوبہ سنکیانگ کے درمیان حد بندی لائن کا تعین کیا گیا۔ اس کے تحت چین کو ریاست کشمیر کا 1868 مربع میل کا علاقہ دے دیا گیا اور یہ طے پایا کہ کشمیر کے مسئلے کے حتمی حل کے بعد کشمیر کے ان علاقوں پر جس کی حکومت ہو گی، یہ معاہدہ از سر نو کیا جائے گا لیکن اگر ان علاقوں پر حاکمیت پاکستان کی ہی رہی تو یہی معاہدہ حتمی تصور ہو گا۔

تاشقند معاہدہ 1965

1965 کی جنگ کے بعد روس کی مداخلت سے 10 جنوری 1966 کو تاشقند میں ایک معاہدہ عمل میں آیا جس کے فوراً بعد ہندوستان کے اس وقت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری، تاشقند میں ہی

وفات پا گئے۔ پاکستان کی طرف سے اس وقت کے فوجی حکمران جنرل ایوب خان اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے شرکت کی اس کا نمایاں پہلو صرف اتنا تھا کہ ہندوستان نے اس جنگ میں آزاد کشمیر کے جس علاقے پر قبضہ کیا تھا، وہ پاکستان کو واپس کیا گیا۔

رَن آف کچھ

19 فروری 1968 کو گجرات میں رَن آف کچھ (Raun of Kutch) پر تنازع پر ایک ٹریبونل قائم کیا گیا جس نے اس علاقے کا 10 فیصد حصہ پاکستان کو اور 90 فیصد ہندوستان کو دیا لیکن اس وقت تک اس پر بھی عمل نہیں ہوا۔

شملہ معاہدہ

1971 کی ہندو پاک جنگ کے بعد جب ہندوستان نے پاکستان کے مشرقی حصے کو کاٹ کر بنگلہ دیش بنوایا۔ شملہ، ہندوستان میں ہندوستان کی وزیر اعظم اندرا گاندھی اور صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان 2 جولائی 1972 ایک معاہدہ عمل میں آیا جو شملہ معاہدہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کے تحت 90 ہزار پاکستانی جنگی قیدی واپس کیے گئے اور طے پایا کہ دونوں ملک کشمیر کے مسئلے کو باہمی گفت وشنید سے حل کریں گے جس کے بعد ہندوستان نے کشمیر کو دو طرف متنازع قرار دیا۔ اس کے بعد CFL کو LOC یعنی لائن آف کنٹرول کے نام میں تبدیل کیا گیا۔

انڈو پاک جوائنٹ کمیشن

1982 میں دو ملکوں کے درمیان ایک معاہدے کے تحت ایک کمیشن قائم کیا گیا جس کے تحت تجارت، سیاحت، ٹیکنالوجی، مواصلات پر مفاہمت عمل میں آئی اور 1989 تک دونوں ملکوں کے متعدد حکام نے ملاقاتیں کیں جس میں کئی معاملات پر معاہدے ہوئے جو زیادہ تر فوجی نوعیت کے تھے۔

ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ

1988 میں پاکستانی وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور ہندوستانی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے درمیان دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جو 1992 میں نافذ العمل ہوا۔ ان معاہدوں کے تسلسل میں کئی فوجی نوعیت کے معاہدے عمل میں آئے۔

کشمیر سے متعلق مفاہمتی عمل

کشمیر میں 1989 کے بعد شروع ہونے والی مسلح جدوجہد کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ سرحدی علاقوں میں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں مجاہدین کشمیر کا آزاد کشمیر آنا جانا شروع ہو گیا۔ دونوں طرف کی فوجیں ان کو روکنے میں بھی بے بس ہو گئیں۔ اور کشیدگی نکتۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اندرون کشمیر ہندوستان کشمیری لوگوں کی عسکری اور سیاسی تحریک کی وجہ سے بے بس ہو گیا جس وجہ سے ہندوستان، پاکستان کی طرف پس پردہ ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو گیا تا کہ کشمیر کے اندر لوگوں کو احساس دلایا جائے کہ ہندوستان کشمیریوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے پاکستان سے بات چیت کر رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر کا حل نکالا جا سکے۔ تمام تر رکاوٹوں، مشکلات اور بداعتمادی کے باوجود دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت کٹتی جڑتی اور پس وپیش کا شکار ہونے کے باوجود، ہندوستان میں کشمیری تحریک کے دباؤ کی وجہ سے آگے بڑھتی رہی جس کا قدم بہ قدم تذکرہ ذیل میں ہے۔

تحریک چلنے کے بعد 2/3 جنوری 1994 کو اسلام آباد میں ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے خارجہ کی ملاقات ہوئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

☆ 4 نومبر 1994 کو ہندوستان کے وزیر اعظم نرسماراؤ نے کشمیر کو اندرونی خودمختاری کا عندیہ دیا اور اعلان کیا کہ کشمیریوں کے لیے اندرونی خودمختاری کی حد آسمان تک ہو سکتی ہے (Sky is the limit) اس کے بعد ہندوستان کی حکومت نے حریت پسندوں سے بات چیت کا آغاز کیا اور 15 مارچ 1996 کو دہلی میں وزیر داخلہ نے ان کے ساتھ بات شروع کی۔ لیکن اس اعلان یا رعایت کا کشمیری فائدہ نہ اٹھا سکے۔

☆ امریکہ نے 18 فروری 1997 کو دونوں ملکوں کو بات چیت کرنے پر مجبور کیا جس کے نتیجے میں 31-28 مارچ 1997 کو ان کے درمیان Back channel ڈپلومیسی شروع ہو گئی اور دونوں ملکوں نے

اس سلسلے میں اپنے نمائندے مقرر کیے۔

☆ 12 مئی 1997 کو وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف اور ہندوستانی وزیراعظم اندر کمار گجرال نے Joint working Group بنا کر 1947 سے چلے آنے والے معاملات کو حل کرنے کا اعادہ کیا۔

☆ 22 جون 1997 دونوں ملکوں نے اتفاق کیا کہ وہ مسائل کو حل کرنے کے لیے Machanisam ہوں گے۔

☆ 23 جون 1997 و دونوں ملکوں کے خارجہ سیکرٹریوں کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے اور تمام مسائل کے حل کے لیے آٹھ نکاتی فارمولہ طے پایا جس میں ورکنگ گروپ بنا کر کشمیر کے مسئلے کے حل پر بھی بات چیت شامل ہے۔ لیکن ہندوستان نے اس پر کوئی پیش رفت نہیں کی۔

☆ 11 مئی 1998 کو ہندوستان نے پاکستان کو مرعوب اور کشمیر کو مغلوب کرنے کے ارادے سے 5 ایٹمی دھماکے کیے جس کے ساتھ ہی ہندوستانی لیڈروں نے پاکستان کو دھمکیاں دینا شروع کیں کہ پاکستان آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو خالی کر دے اور اس کے ساتھ ہی 21 مئی 1998 کو لاکھوں فوجیں کشمیر کی سرحدوں پر بھیج دیں۔

☆ پاکستان نے اپنے دفاع میں اس کے جواب میں 28 اور 30 مئی 1998 کو چھے ایٹمی دھماکے کر کے ہندوستان کو نہ صرف ترکی بہ ترکی جواب دیا اور توازن بحال کیا، بلکہ برتری کا اظہار بھی کیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے لیڈروں کا تندوترش رویہ بدل گیا اور مفاہمت اور مصالحت کی باتیں شروع کیں۔

☆ 28 جولائی 1998 کو سری لنکا میں سارک کانفرنس کے موقع پر ہندوستانی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اور پاکستانی وزیراعظم میاں محمد نواز شریف نے اتفاق کیا کہ دونوں ملکوں کے سیکریٹری خارجہ بات چیت کے لیے ٹائم ٹیبل بنائیں۔ 19 اگست 1998 ہندوستانی وزیراعظم نے پاکستان کے ساتھ Composite بات چیت کا اعلان کیا۔

☆ 19 فروری 1999 کو ہندوستانی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے دہلی لاہور بس سروس کا آغاز کرتے ہوئے خود اس بس میں لاہور تشریف لائے جہاں 21 فروری 1999 کو وزیراعظم پاکستان

میاں محمد نواز شریف کے ساتھ مشہور لاہور ڈیکلریشن پر دستخط کیے جس میں کشمیر سمیت متعدد امور پر مفاہمت پر بھی اتفاق کیا گیا۔ اس معاہدے کو جنرل مشرف کی کارگل پر کشمیری مجاہدین کے نام سے مہم جوئی نے ناکام بنا دیا جس نے مئی تا جولائی 1999 میں کارگل میں ہندوستان کے زیر انتظام خالی چوکیوں پر قبضہ کر کے دو ملکوں کو جنگ کے دہانے پر پہنچا دیا۔ اس کا اختتام 4 جولائی 1999 کو وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کی 4 جولائی 1999 کو واشنگٹن میں امریکی صدر کلنٹن کے ساتھ ملاقات میں چوکیاں خالی کرنے اور مجاہدین/فوجیوں کو وہاں سے بحفاظت واپس نکالنے پر اتفاق ہوا۔ نہ صرف اس نے پاکستان کے وقار اور کشمیری تحریک آزادی کو سنگین نقصان پہنچایا بلکہ LoC کو بھی متبرک بنا دیا۔ جنرل مشرف نے صرف اس پر بس نہیں کیا بلکہ، 12 اکتوبر 1999 کو نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر کے خود حکومت پر قبضہ کر لیا اور عبوری آئین نافذ کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کا عمل رک گیا۔

☆ 23 مئی 2001 کو ہندوستانی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے کشمیر میں کشمیری مجاہدین سے جنگ بندی کا اعلان کرتے ہوئے جنرل مشرف کو بات کرنے کی دعوت دی اور اس کے ساتھ ہی کشمیر کے آزادی پسند لوگوں سے بھی بات چیت کا آغاز کر دیا۔

☆ 14 تا 16 جولائی 2001 کو جنرل مشرف نے آگرہ، ہندوستان کا دورہ کیا اور صرف ''کشمیر کے ایک نکاتی ایجنڈے'' پر بات کی جو بے نتیجہ رہی۔ یہ جنرل مشرف کا بچگانہ عمل تھا جیسے کہ وہ CO کی حیثیت سے کسی یونٹ سے بات کر رہا ہو۔

☆ اکتوبر 2001 میں پہلے کشمیر اسمبلی اور دسمبر 2001 میں ہندوستانی پارلیمنٹ پر کشمیری مجاہدین کے حملہ کی وجہ سے تعلقات دوبارہ کشیدہ ہو گئے۔ اس کے بعد ہندوستان نے کشمیر اور راجستھان بارڈر پر دس لاکھ فوج جمع کر دی اور دونوں ملکوں میں کشیدگی نکتہ عروج پر پہنچ گئی۔

☆ 18 اپریل 2003 کو اٹل بہاری واجپائی نے سرینگر میں ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ ''پاکستان کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں'' جس کے بعد تعلقات دوبارہ معمول پر آنا شروع ہو گئے۔

☆ 06 جنوری 2004 کو ہندوستانی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی سارک کانفرنس میں شرکت

کے لیے اسلام آباد آئے، جہاں صدر پاکستان جنرل مشرف کے ساتھ مشترکہ علامیے جاری کر کے تعلقات کو بحال کرنے اور جموں وکشمیر کو پر امن طریقے سے حل کرنے پر اتفاق کیا۔تمام کشمیری لیڈروں نے اس علامیے کا خیر مقدم کیا۔

☆ 24 ستمبر 2004 کو نیو یارک میں ہندوستانی وزیر اعظم سردار من موہن سنگھ اور پاکستانی صدر جنرل مشرف کی ملاقات کے بعد علامیہ میں 06 جنوری کے مفاہمتی علامیہ پر عمل کرنے کا اعادہ کیا گیا جو ایک اچھی پیش رفت تھی۔

☆ 16 فروری 2005 کو پاکستان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری اور ہندوستانی وزیر خارجہ نٹور سنگھ کے درمیان اسلام آباد میں ایک سمجھوتے کے تحت سرینگر اور مظفر آباد کے درمیان بس سروس شروع کرنے کا معاہدہ ہوا۔ ریاستی باشندے دونوں حصوں کی مقامی اتھارٹیز کی جانب سے جاری شدہ پرمٹ پر سفر کر سکیں گے۔اس میں بتدریج بہتری آتی گئی۔اس وقت چکوٹھی، ٹیٹوال اور تیتری نوٹ کے مقامات سے بھی ریاست کے دونوں حصوں میں آمدورفت جاری ہے۔۔

☆ 07 اپریل 2005 کو سرینگر مظفر آباد بس سروس کا آغاز ہوا۔ یہ پہلی بس تھی جو 1947 کے بعد سرینگر، راولپنڈی بذریعہ جہلم ویلی روڈ پر شروع ہوئی، جو اب تک جاری ہے۔ یہ علامتی عمل کیوں کہ سرینگر والی بس اوڑی کے کمان پل تک جبکہ مظفر آباد والی بھی اپنی حدود تک جاتی ہے آر پار مسافر پیدل کراس کرتے ہیں۔

☆ 02 جون 2005 کو حریت کانفرنس میر واعظ گروپ کے نو لیڈر سرینگر سے مظفر آباد بس میں تشریف لائے جن میں میر واعظ عمر فاروق کے علاوہ پروفیسر عبدالغنی بٹ، یاسین ملک، عباس انصاری بھی شامل تھے۔ چکوٹھی کے مقام پر پاکستان کے وزیر اعظم چوہدری شجاعت حسین کے علاوہ بین الاقوامی میڈیا بھی موجود تھا۔

☆ 18 اپریل 2005 کو پاکستانی صدر جنرل مشرف اور ہندوستانی وزیر اعظم من موہن سنگھ کے درمیان دہلی میں ملاقات کے موقع پر ماقبل سارے سمجھوتوں پر عمل کرنے پر اتفاق کے علاوہ علامیہ میں طے پایا کہ کشمیر کے مسئلہ کے حتمی حل کی کوشش کی جائے گی، کشمیر میں سرحد کی دونوں جانب لوگوں کی آپس میں ملاقات اور ملنے جلنے کی سہولت، تجارت، مذہبی مقامات کی زیارت، کلچرل تعلقات کو ممکن بنایا

جائے گا۔بس سروس کے عمل کو وسیع کیا جائے گا، تجارت بڑھانے کے لیے ٹرک سروس شروع کی جائیگی، کشمیر کے دونوں حصوں میں آمدورفت کے لیے مزید روٹس کھولے جائیں گے جن میں راولاکوٹ پونچھ بھی شامل ہوگا وغیرہ۔اس کے بعد کشمیر کے دونوں حصوں میں تجارت ہو رہی ہے جس کا فائدہ کشمیر یوں کے نام پر ہندوستانی اور پاکستانی تاجر اٹھا رہے ہیں لیکن فرنٹ پر کشمیری ہی ہیں۔

☆ اس کے بعد 2006 میں راولاکوٹ پونچھ کے درمیان بھی بس سروس کا آغاز ہوا۔

☆ ستمبر 2006 میں ممبئی (بمبئی) حادثہ کے باوجود جنرل مشرف صدر پاکستان اور وزیر اعظم من موہن سنگھ ہندوستان کے درمیان Havana کانفرنس میں بات چیت جاری رکھنے پر اتفاق ہوا۔

☆ دسمبر 2006 میں جنرل مشرف نے اپنا مشہور چار نکاتی فارمولہ پیش کر کے اس کو Out of Box Solution کا نام دیا جس کے تحت سرحدوں کو نرم کر کے آنا جانا آسان بنایا جائے گا، شہروں سے بتدریج فوجوں کو نکالا جائے گا، جوائنٹ میگنزم تشکیل دیا جائے گا، دونوں حصوں میں سیلف گورننس یا خود مختاری ہوگی لیکن آزادی نہیں۔ یہ عمل ابتدائی طور پر پندرہ سال کے لیے ہوگا۔سوائے سید علی گیلانی صاحب کے باقی کشمیری لیڈروں نے اس سے اتفاق کیا تھا۔لیکن ہندوستان کی طرف سے اس کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا کوئی سرکاری اعلان نہیں ہوا تھا تاہم ہندوستان اس سے خوش تھا کہ پاکستان سلامتی کونسل کی قراردادوں اور الحاق پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو گیا۔دونوں ملک اس بات پر سرکاری طور اب کہتے ہیں کہ اگر جنرل مشرف پاکستان میں چیف جسٹس افتخار چوہدری کی وجہ سے انتشار کا شکار نہ ہو جاتے تو دونوں ملک اس سمجھوتے پر دستخط کر لیتے۔

☆ فروری 2007 میں سمجھوتا ایکسپرس کے حادثے کی وجہ سے کشمیر پر دونوں ملکوں کے درمیان دوبارہ تعلقات میں تعطل پیدا ہو گیا۔

☆ جون 2008 میں حکومت ہندوستان کی طرف سے امرناتھ یاترہ کے لیے ہزاروں کنال اراضی منتقل کرنے پر کشمیر میں دوبارہ تحریک شروع ہو گئی جس وجہ سے مزید کوئی پیش رفت ممکن نہ رہی۔

☆ جولائی 2010 کو دو ملکوں کے درمیان خارجہ سیکرٹریوں کے درمیان دوبارہ بے نتیجہ کانفرنس ہوئی۔

☆ اکتوبر 2010 کو ہندوستانی حکومت نے تین اراکین پر مشتمل ایک Interlocutors کی کمیٹی

مقرر کی جس کی سفارشات کے باوجود اس پر کوئی عمل نہیں ہوا۔

☆ 2010 میں ہی 120 کشمیریوں کے ہندوستانی فوج کے ہاتھوں مارے جانے سے کشمیر میں تحریک پھر زور پکڑ گئی۔

پگواش کانفرنسز جموں وکشمیر سے متعلق بین الاقوامی تھنک ٹینک پگواش نے 2004 سے 2013 تک چھے کانفرنسز کا مختلف ملکوں (بشمول اسلام آباد) انعقاد کیا جس میں کشمیر کے دونوں حصوں اور ہندوستان و پاکستان کے لوگ شامل ہوتے رہے۔ انہوں نے لوگوں کو قریب لانے کا وقع دیا لیکن دونوں ملکوں سے کوئی بات منوانے میں کامیابی نہیں ہوسکی۔

(CDR) Centre for Dialogue and Reconciliation

ایک ہندوستانی تھنک ٹینک نے کشمیر کے دونوں حصوں کے لوگوں، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر سے متعلق تنازعات کے پس منظر میں امور کو افہام وتفہیم سے نمٹانے کے لیے کشمیر کے دونوں حصوں اور ہندوستان اور پاکستان میں کئی جگہ کانفرنسز کروائیں جس کی روح رواں سوشوبھا بھا روے اور پاکستان میں شیریں رحمان رہی ہیں۔ بدقسمتی سے کوئی حتمی حل تو نہیں نکال سکے لیکن تجارت، آمدورفت، نوجوانوں، خواتین، ثقافت وغیر کے حوالے سے قربت کے امکانات پیدا کروائے۔

☆ 2006 کی مفاہمت کے بعد پاکستان میں کشمیری طلبہ کا آنا جانا شروع ہوا۔ پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں Business Administration , Medical, Engineering وغیرہ کے شعبوں میں کشمیری طلبہ تعلیم حاصل کر کے کچھ تو یہیں آباد ہوجاتے ہیں اور کچھ بیرون ملک یا واپس کشمیر بھی چلے جاتے ہیں۔ ان کی تعلیم کا خرچ بھی حکومت پاکستان برداشت کرتی ہے۔ بین الاقوامی معاہدوں اور سارک ممالک کے معاہدے کے تحت اس سہولت کا فائدہ صرف کشمیری طلبہ اٹھاتے ہیں۔ کشمیر کی حریت کانفرنس کو بھی یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ طلبہ کو اس کے لیے نامزد کریں۔ اس سہولت نے کشمیر اور پاکستان میں بہت قربت پیدا کردی ہے۔

☆ 26 مئی 2014 کو ہندوستان میں نریندر مودی کے وزیر اعظم کے حلف میں وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف نے شرکت کی لیکن اس کے باوجود حکومت کے بننے کے بعد کشمیر پر ہی کیا

ہندوستان پاکستان کے درمیان بھی ہر قسم کی سفارتی اور سیاسی پیش رفت 341 کا شکار ہوگئی بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان مزاحمت عروج پر اور کشمیر کے اندر ظلم وستم انتہا کو چھونے لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کشمیر کے اندر مزاحمت بھی نکتہ عروج پر اور پاکستان بھی کشمیر کے معاملہ کو دنیا کے ہر پلیٹ فارم پر اٹھانے میں غیر معمولی طور مستعد ہوگیا ہے۔

☆ 25 دسمبر 2015 کو ہندوستانی وزیر اعظم نریندر مودی، لاہور تشریف لائے۔

☆ میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم پاکستان نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی، اسلامی سربراہی کانفرنس، یورپی یونین میں بھرپور آواز بلند کی۔

ملکی سطح پر پہلی بار سرکاری طور 19 جولائی 2016 کو یوم الحاق پاکستان منایا گیا۔

☆ 20 جولائی 2015 کو کشمیر پر بھارتی ظلم کے خلاف یوم سیاہ منایا۔

☆ 8 جولائی 2016 کو کشمیر میں برہان مظفر وانی ایک نوجوان مجاہد کی شہادت کے بعد کشمیر ہندوستان کے کنٹرول سے باہر ہوگیا ہے اور مکمل فوج کے کنٹرول میں دے دیا گیا ہے۔ پاکستان نے اس کو شہید کشمیر قرار دیا۔ اس واقعہ نے ہندوستان کو اتنا ہی پریشان کردیا ہے، جتنا یہ 94-1990 کے دوران ہوا۔ اب کی بار پاکستان کی غیر معمولی سفارتی حمایت نے تو کشمیریوں کے حوصلے بھی بلند کردیئے ہیں۔

مسئلہ کشمیر اور ممکنہ حل

کشمیر زمین کا تنازع نہیں بلکہ حقوق اور انسانیت کا مسئلہ ہے۔ بدقسمتی سے اس کو سفارت کاری، سیاست کاری اور صحافت نے اپنے کاروبار اور روزگار کا مسئلہ بنا کر زمینی حقائق کو ایسا گڈمڈ کردیا ہے کہ اس کا سرا ہی دکھائی نہیں دے رہا۔ سیاست دانوں کے لیے اس سے زیادہ سودمند فی الوقت اور کوئی کاروبار نہیں جس کو نسلوں کی سرمایہ کاری کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔

کشمیر فی الواقع صرف وادی کشمیر ہے جو 90 میل لمبی اور 35 میل چوڑی ہے۔ مشرق کی طرف سے اس کی حدود پانہال پاس اور شمالی مشرق کی طرف سے پیر پنجال، جنوب مشرق کی طرف سے توسہ میدانی، مغرب کی طرف سے مظفر آباد، شمال کی طرف سے زوجیلا پاس، جبکہ شمال مغرب کی طرف

سے برزل پاس تک پھیلے ہیں۔ اس سے متصل مضافاتی علاقے وادی چناب، وادی پیر پنجال اور ضلع مظفر آباد، صوبہ کشمیر کے مضافاتی علاقے گردانے جاسکتے ہیں۔ (کشمیر وادی کا اصل نقشہ ضمیمہ میں شامل ہے)۔ یہ وادی، وسطی ایشیا اور سوات کے شاہ میریوں اور چکوں کے زمانے سے لے کر اس وقت تک مختلف بیرونی خاندانوں اور حکمرانوں کے زیر تسلط رہ کر ایک ملک کے طور جانی پہچانی جاتی رہی ہے۔ مغلوں، افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں نے بالترتیب یہیں بیٹھ کر برصغیر کے مختلف علاقوں تک اپنے پاؤں پھیلائے جس کی وجہ سے آج تک کچھ کشمیری قوم پرستوں کا خیال ہے کہ پاکستان، ہندوستان، افغانستان اور وسط ایشیا کے کچھ علاقے بھی کشمیر کا حصہ تھے۔ اصل میں ان علاقوں کے لوگوں نے کشمیر پر قبضہ کر کے اپنی جڑیں اپنے اپنے علاقوں تک پھیلائیں جس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ علاقے کشمیر بن گئے بلکہ کشمیر ان خاندانوں کا مقبوضہ علاقہ رہا۔

ریاست جموں وکشمیر اصل میں 9 مارچ 1846ء کو وجود میں آئی جب سکھوں نے انگریزوں کے مقابلے میں جنگ ہارنے کی وجہ سے صوبہ کشمیر کا علاقہ بطور تاوانِ جنگ انگریزوں کو دیا جنہوں نے 16 مارچ 1846ء کو یہ علاقہ جموں کے ڈوگرہ راجہ کو بالعوض 75 لاکھ روپے منتقل کیا۔ ڈوگرہ مہاراجہ کے قبضہ میں اس سے پہلے جموں کے مضافاتی علاقوں کے علاوہ، گلگت، بلتستان، ہنزہ، نگر وغیرہ کے علاقے بھی آچکے تھے۔ اس طرح جغرافیائی طور پر ایک منظم اور مربوط ریاست وجود میں آگئی، لیکن اس کی اکائیوں کی شناخت نے اس عمل کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اگر انگریزوں نے 9 مارچ والے معاہدے کی بنیاد پر ریاست اپنے پاس رکھی ہوتی تو برٹش انڈیا کی تقسیم کے ایجنڈے کے مطابق اس نے پاکستان کے ساتھ ہی جانا تھا اور یہ تنازع کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔

1846 کے ڈوگرہ اور انگریزوں کے امرتسر معاہدہ کے بعد سے 1947 کی تقسیم برصغیر تک ڈوگرہ حکمران نے کشمیر پر قبضہ کرنے کے بعد جن جن علاقوں کو اپنی قلمرو میں لایا، ان کو عرف عام یا غلط العام میں ریاست جموں وکشمیر کہا جاتا ہے۔ ان تمام علاقوں کی اپنی الگ الگ شناخت تھی اور اب تک اس شناخت کو بحال رکھنے میں ان علاقوں کے لوگ سرگرداں ہیں۔ مثلاً لداخ کے لوگ لداخی، کارگل

کے بلتی، گلگت بلتستان کے گلگتی یا بلتی، پونچھ کے پونچھی، جموں کے جموال وغیرہ۔ ان علاقوں کے لوگ جب بھی وادی کشمیر میں جاتے ہیں تو یہی کہہ کر جاتے ہیں کہ ''ہم کشمیر جارہے ہیں۔''

مقبوضہ کشمیر کے آئین کے تحت ریاست ان علاقوں پر مشتمل ہے جو 15 اگست 1947 کو ریاست جموں وکشمیر کی حکومت میں شامل تھے۔ لیکن ہندوستان کے آئین میں یہ بات نہیں ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے آئین کی بنیاد پر ہندوستان کا یہ موقف ہے کہ پوری ریاست مہاراجہ کے الحاق نامہ کے بعد اس کا حصہ ہے جس میں پاکستان کے زیر کنٹرول علاقے بھی شامل ہیں۔ کشمیر کے آئین میں یہ درج کیا گیا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔ یہ ہندوستان کے آئین میں نہیں ہے نہ ہی پاکستان کے زیر انتظام علاقے ہندوستان کے آئین میں شامل ہیں بلکہ چند ایک دفعات کے تحت ان کو خصوصی طور پر نکالا گیا ہے۔ تاہم ہندوستانی پارلیمنٹ کی 1994 کی متفقہ قرارداد کے ذریعہ ان علاقوں کو ہندوستانی علاقے قرار دیا گیا ہے۔

کشمیر کی تقسیم کے وقت جو علاقے پاکستان کے زیر کنٹرول آگئے، ان میں صوبہ کشمیر سے ضلع مظفر آباد، صوبہ جموں سے پونچھ، میر پور، کوٹلی کے علاقے ہیں جن کو آزاد کشمیر کہا جاتا ہے۔ یہ علاقے لسانی، تہذیبی، جغرافیائی اور نسلی اعتبار سے ضلع ہزارہ اور پنجاب کے پوٹھوہار ہی کا حصہ ہیں۔ یہ ایک نیا سیاسی اور جغرافیہ ہے۔ جبکہ گلگت وبلتستان سرحدی صوبے کے علاقے ہیں جو الگ یونٹ کے طور پر ہیں۔

آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے آئین کا قطعاً یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہاں کی حکومتیں پوری ریاست کی نمائندہ حکومتیں ہیں اور نہ ہی پاکستان کا آئین اس بات کا دعوے دار ہے۔ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ اس اہم آئینی معاملہ پر ان علاقوں اور پاکستان کا آئین کیوں خاموش ہے جبکہ مہاراجہ کشمیر کے 12 اگست 1947 کے معاہدہ ''جوں کا توں'' کے پاکستان کی طرف سے منظوری کے بعد پوری ریاست کو پاکستان کا متنازع اور اس کے زیر انتظام علاقوں کو کشمیر کے حتمی حل تک اس کا حصہ ہونا چاہیے تھا تاکہ ملکی آئین اور تاریخی پس منظر کی طاقت کی بنا پر پاکستان بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کے اس دعویٰ کی نفی

کرسکتا جو وہ اٹوٹ انگ کی رٹ لگا کر، کر رہا ہے۔ اس معاہدے کے تحت حکومت پاکستان کو ریاست جموں وکشمیر پر وہی حقوق حاصل ہو گئے ہیں جو برٹش انڈیا کی حکومت کو ریاست پر تھے۔ حکومت پاکستان اس معاہدے کا فائدہ نہ اٹھا سکی۔ یہ ہمارے آئین اور پالیسی سازوں کی غفلت اور عدم دلچسپی کی انتہا ہے جس کا اگر اب بھی تدارک نہ کیا گیا تو مستقبل میں اس کے سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ اگر یہ علاقے پاکستان کا حصہ نہیں ہیں تو کیا ہندوستان کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ پوری ریاست اس کا اٹوٹ انگ ہے؟

اگر ہندوستانی حکومت نے کسی وقت حریت کانفرنس کے لیڈروں (جن کو پاکستان کشمیر کا حقیقی نمائندہ تسلیم کرتا ہے) کو بھی یہ ماننے پر کسی حیلے بہانے سے منوالیا کہ، پاکستان سے کشمیر ریاست کے علاقے خالی کرنے کا مطالبہ کریں جس صورت میں پورے کشمیر کو خودمختاری یا 1947 سے پہلی والی حیثیت دی جائے گی، اس وقت کیا صورتِ حال پیدا ہوگی؟ بالفرض ایسا وقت آجاتا ہے اور ریاست کے پاکستانی حصے کے لوگ بھی دوسرے حصے والوں کا ساتھ دیں اس وقت کیا ہوگا؟ بین الاقوامی معاملات میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہمارے پالیسی سازوں کو اس کا ادراک کرنا چاہیے۔ اور آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو آزادی کے ایک ایسے ماڈل کے طور پر پیش کرنا چاہیے کہ سربکف کشمیری، ہندوستان سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اس ماڈل کو قبول کریں۔ ورنہ آزادی کے بعد ریاست کی اس آزادی کا ماڈل قبول کرنا پڑے گا جو کشمیری پیش کریں گے، وہ بڑا خوف ناک منظر ہوگا۔

ہمارے کچھ قوم پرست کشمیری رہنماؤں کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ ریاست متحدہ ہندوستان کے دوران ایک آزاد اور خودمختار ملک کے طور پر قائم تھی۔ یہ غلط تاثر ہے۔ اصل میں یہ ریاست ڈوگروں کے ذریعہ انگریزوں کے تسلط میں تھی جس کے اندرونی معاملات انگریزوں کے ریذیڈنٹ کے تابع اور خارجی معاملات بشمول کرنسی وغیرہ برٹش انڈیا کے کنٹرول میں تھے۔ جب مہاراجہ پرتاب سنگھ کو 1889 میں معزولی کے بعد 1905 میں بحال کیا گیا تو ان کے اختیارات اتنے محدود کر دیئے گئے کہ اندرون کشمیر بھی انگریز ریذیڈنٹ کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتے تھے۔ جو ان پابندیوں کے علاوہ تھے جو ریاست کے مالیات، ٹیکس، جاگیروں کی منظوری، بیرونی تعلقات سے متعلق تھے۔ حتیٰ کہ

341

ریاست کے اندر کسی گزٹیڈ آفیسر کی تقرری اور برطرفی بھی حکومت ہندوستان کو معقول وجہ بتانے کے بعد ہی ہوسکتی تھی۔

ریاست کے اندر رہنے والے لوگوں کی سوچ تضادات کا مجموعہ ہے جو اولاً تو کشمیری اور غیر کشمیری بولنے والے لوگوں میں منقسم ہیں اور پھر پہاڑی، گوجروں میں۔ جموں اور لداخ کے لوگ ہندوستان کے قریب ترین اور وادی کشمیر سے کوسوں دور ہیں، جبکہ وادی کشمیر کے کشمیری بولنے والے لوگ وادی کے اندر غیر کشمیر بولنے والے لوگوں سے دور اور جموں ولداخ کے لوگوں سے الگ تھلگ ہیں۔ اس طرح آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے لوگوں کی سوچ بھی یکسر مختلف ہے۔ آزاد کشمیر کے اندر بھی تضادات بالکل واضح ہیں۔ وادی سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کو مقامی لوگ مقامی طور پر کشمیری اور جب پاکستان کے کسی علاقہ میں ہوں تو اپنے آپ کو بھی کشمیری کہتے ہیں۔ اس کے برعکس آزاد کشمیر کے لوگ جموں کے علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والوں کو اپنے زیادہ قریب سمجھتے ہیں۔

اس طرح آزاد کشمیر میں کشمیری ذاتوں مثلاً لون، میر، ترنبوزر گروغیرہ کو کشمیری کہتے ہیں۔ اس کے برعکس مقبوضہ کشمیر میں تقسیم جموں، کشمیر، اور لداخ کے علاوہ کشمیری، پہاڑی اور گوجر کی بنیاد پر ہے۔ گوجر، پہاڑی، لداخی اور جموں والے اپنے آپ کو کشمیری نہیں بلکہ اپنی Ethnic شناخت سے متعارف کراتے ہیں۔ اسی تقسیم در تفریق کا فائدہ اٹھا کر ہندوستان یہ کہتا ہے کہ صرف وادی کشمیر کے کشمیری بولنے والے لوگ شر پسند ہیں جبکہ گوجر، شیعہ اور پہاڑی ہندوستان کے ساتھ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے مسلمان سب ہندوستان کے خلاف ہیں خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتے اور کسی بھی خطے میں رہتے ہوں۔ سیاسی کھڑپینچ اپنی دکان چمکانے کے لیے اس تفرقہ بازی کو ہوا دے رہے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کوئی قدرتی ملک نہیں ہے۔ وادی کشمیر اور گلگت و بلتستان کے لوگوں نے ڈوگروں کے تسلط کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی اپنے انفرادی تشخص پر کبھی سمجھوتا کیا۔ ان خطوں کا باہمی اور ایک دوسرے کو تسلیم نہ کرنا اظہر من الشمس ہے، اس لیے ان کو یکجا کیے جانے کا جبر بھی حق خود اختیاری کے مغائر ہے۔ جموں اور لداخ کی غالب اکثریت نے وادی کشمیر کے لوگوں کی امنگ کے بر

عکس ہمیشہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کا ساتھ دیا جبکہ وادی مرکز کے خلاف رہی ہے۔ یہی صورتِ حال آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی ہے جو مرکز یعنی پاکستان کے ساتھ ہے اور ان کا طرزِ زندگی۔ سوچ اور فکر بھی منفرد ہے۔ معاہدہ امرتسر 1846 سے 1947 تک صرف کشمیر وادی ہی اسی جبری تسلط کے خلاف برسرِ پیکار رہی، اب بھی یہی برسرِ پیکار ہے۔ کچھ خوش فہم اس صورت کو بحال کرانا چاہتے ہیں جس کے خلاف وادی سو سال لڑتی رہی۔

وادی کے لوگوں کا ایک مخصوص مزاج ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ریاست کے بقیہ حصے اپنی موجود پوزیشن سے مطمئن ہیں ریاست کی 1846 والی پوزیشن بحال کرنا پریشان خیالی کے سوا کچھ بھی نہیں اور تنازعہ قائم رکھنے کی سعی ہے۔ وادی کے لوگوں کا مزاج سمجھنے کی ضرورت ہے، یہاں کے لوگوں کے ایک طبقے نے پہلے غاصب کو نکالنے کے لیے دوسرے کو دعوت دی ہے۔ ایک طبقہ پہلے غاصب کی حمایت کرتا رہا جبکہ دوسرے نے نئے مسلط ہونے والے کی طرف داری کی۔ جموں کا ڈوگرہ واحد غاصب تھا جو کشمیر کے کسی طبقے کی دعوت پر نہیں آیا بلکہ انگریزوں نے ان پر مسلط کیا۔ یہی وجہ تھی کہ وادی کے اندر ڈوگروں کا کوئی حامی طبقہ نہ تھا جیسا کہ ان سے پہلے تھا یا آج کل ہے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر ان پر کسی کو مسلط ہونے یا کرنے سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا بلکہ ان کو اپنے حال اور اپنے حل کو تلاش کرنے دینا چاہیے۔ البتہ اپنی طرف راغب کرنے کے لیے کوئی ماڈل پیش کرنا چاہیے۔ ہندوستان کا 370 والا ماڈل بھی انہوں نے قبول نہیں کیا۔ آزاد کشمیر کے ایکٹ 1974 والا ماڈل قبول کرنے کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔

Alastair Al Ostair Lamb نے اپنی کتاب "Kashmir A Disputed Legacy" کے صفحہ 174 پر Own Dixon کے حوالہ سے لکھا ہے:

"The State of Jammu & Kashmir is not really a unit geographically, demographically or economically. It is an agglomeration of territories brought under political power of one Maharaja. That is the unity it posses."

یہ تضاد 1846 سے اب تک چلا آرہا ہے۔ چنانچہ جب مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی جس کے بعد جلد ہی یہ تقسیم ہوگئی، وادی کشمیر کے لوگ شیخ عبداللہ (مرحوم) کی قیادت میں نیشنل کانفرنس میں اور چوہدری غلام عباس (مرحوم) کے ساتھ جموں سے تعلق رکھنے والے غیر کشمیری بولنے والے رہے۔ اسی وجہ سے تقسیم کشمیر کے وقت جموں کے لاکھوں لوگوں نے مجموعی طور پر پاکستان ہجرت کرنے کو ترجیح دی جن میں سے ہزاروں لوگ شہید ہوگئے اور مسلم کانفرنس جموں سے تعلق رکھنے والی قیادت کرنے والے سارے لوگ بھی ہجرت کر کے پاکستان آگئے، جبکہ وادی کشمیر سے چند ہزار لوگ جو میر واعظ یوسف شاہ صاحب (مرحوم) سے وابستہ تھے، نے ہجرت کی جس سے تقسیم واضح اور صاف ہے۔ ہندو مسلمان کی تقسیم تو چلی آرہی تھی لیکن وادی کے اندر مسلمانوں کی غالب اکثریت کے باوجود، غیر مسلم اقلیت کبھی خطرہ سے دوچار نہیں ہوئی، لیکن دونوں کا ایک دوسرے سے کھٹا میٹھا پیار رہا ہے۔ فساد کبھی نہیں ہوا لیکن تقسیم بہرحال نمایاں تھی۔

1990 کی مسلح تحریک کے بعد وادی کی تقریباً تمام ہندو آبادی جموں یا ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہوگئی۔ تاہم سکھوں نے مجموعی طور پر ہجرت نہیں کی لیکن جموں اور دیگر ہندوستانی ریاستوں میں اپنے لیے ٹھکانے تلاش کر لیے۔ ہندوؤں کی کشمیر کی وادی سے ہجرت کے بعد وادی کے اندر 99.9 فیصد مسلمان ہی آباد ہیں۔ جبکہ جموں صوبے میں آبادی کا تناسب بگڑ گیا۔ اس تحریک کے دوران کشمیر کے آسودہ حال مسلمانوں نے بھی جموں میں اپنے لیے مکان یا فلیٹ لیے، جس کا مقصد جموں منتقل ہونا نہیں بلکہ سردیوں کے ٹھکانے، بچوں کی تعلیم و تربیت اور وادی میں فوجی شر سے بچنے کے لیے ہے۔

تحریک کے ابتدائی دنوں میں غیر تربیت یافتہ اور اَن پڑھ گنوار لوگوں کے ہاتھ بندوق چڑھنے کی وجہ سے کئی آسودہ حال مسلمان گھرانے بھی ہندوؤں کی طرح خوف زدہ ہو کر جموں اور ہندوستان کے دیگر صوبوں میں ہجرت کر گئے کیوں کہ ان غیر تربیت یافتہ لوگوں نے ذاتی حرص و ہوس اور انتقامی کارروائیاں کیں جس کے لیے وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں تھے۔ لیکن ہجرت کرنے والے

مسلمانوں نے وادی سے اپنا رشتہ نہیں توڑا جبکہ ہندو آبادی اپنا مال واسباب فروخت کر کے چلی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وادی کشمیر تقریباً مکمل طور مسلمان آبادی پر مشتمل رہ گئی۔ اب وہاں پر ہندو آبادی صرف فوج کی صورت میں قابض ہے، وگرنہ وادی اور پاکستان میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ اس طرح تقسیم اور واضح ہوگئی ہے۔

بہ ایں ہمہ وادی کشمیر میں لوگوں کی رائے واضح نہیں ہے جو ہندوستان، پاکستان اور خودمختار کشمیر کے فلسفہ میں گڈ مڈ ہے۔ 2004 کے بعد جتنے اور جس سطح پر بھی الیکشن ہوئے اس میں شہری علاقوں کے علاوہ سب لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کا مقصد ہندوستان کے حق میں ہونا نہیں، بلکہ اپنے مقامی مسائل کا حل اس میں سمجھتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی لوگوں نے مقامی جماعتوں نیشنل کانفرنس اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کو ترجیح دی اور کچھ نے کانگریس کو بھی ووٹ دیئے، جبکہ پاکستان نواز سید علی گیلانی کی ہندوستان مخالف کال پر بھی اسی جوش وجذبہ سے عمل کرتے رہے، لیکن بائیکاٹ کال کے باوجود ووٹ ڈالنے جاتے رہے۔ اس وجہ سے وادی کشمیر کے لوگوں کی رائے میں تضاد سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت بھی وادی میں وہی صورتِ حال ہے جو 50 کی دہائی میں تھی، جب ڈکسن نے صرف وادی کی حد تک رائے شماری کی تجویز دی تھی، جبکہ ریاست کے باقی حصوں کی رائے کو For Granted لیا تھا یعنی آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے لوگوں کی رائے پاکستان کے حق میں جواب زیادہ واضح ہے، جبکہ جموں اور لداخ کے لوگ ہندوستان کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں، اس کی وجہ اقتصادی فوائد سے منسلک ہوگئی ہے۔ الیکشنز میں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے لوگوں نے ہمیشہ پاکستانی جماعتوں کو ترجیح دی جبکہ جموں اور لداخ والوں نے مرکزی اور صوبہ کشمیر کے لوگوں نے مقامی جماعتوں کو۔ آزاد کشمیر میں قوم پرستوں نے ہمیشہ الیکشن سے فرار اختیار کیا اور بہانہ یہ بنایا کہ وہ الحاق پاکستان کا حلف نہیں اٹھاتے اس لیے الیکشن سے روکے جاتے ہیں۔ جبکہ الیکشن میں اپنی اپنی پسند کی سیاسی جماعتوں کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ اکثر بے روزگار لوگ قوم پرستی کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن اندرون ملک روزگار ملنے یا بیرون ملک پناہ لینے کی صورت میں اپنا مسئلہ حل سمجھتے ہیں اور کشمیر کا مسئلہ این جی اوز کے پلیٹ فارم پر ڈسکس کرتے ہیں۔

مقبوضہ ریاست کے اندر سرگرم مقامی، وفاقی، مین سٹریم اور نان مین سٹریم جماعتوں کا بھی کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے الگ الگ ایجنڈا ہے جس سے اس حقیقت کو تقویت ملتی ہے کہ اس مسئلے کے حل کے بغیر ہندوستان میں سیاسی استحکام اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات معمول پر نہیں آسکتے۔ دونوں ملک حالت جنگ میں رہیں گے۔ یہاں کے لوگ اقتصادی بدحالی اور پسماندگی کا شکار رہیں گے۔

مین سٹریم مقامی جماعتوں میں سے نیشنل کانفرنس ریاستی تقسیم کی موجودہ صورت حال کو بحال رکھتے ہوئے ہندوستان کے آئین کے اندر کشمیر کی اٹانومی میں اس کا حل سمجھتی ہے جس کے تحت مہاراجہ کے الحاق نامہ کی شرائط کے تابع دفاع، خارجہ کرنسی اور کمیونیکیشن کے علاوہ سارے معاملات ریاست کی تحویل میں ہوں۔ جبکہ پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (PDP) اٹانومی سے ملتا جلتا حل سیلف رول تجویز کرتی ہے جس میں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان پر پاکستان کی حاکمیت تسلیم کر کے ریاستی باشندوں کے کشمیر کے ایک دوسرے حصے میں آنا جانا آسان بنایا جائے اور مشترکہ مفادات کے چند معاملات کو ہندوستان پاکستان اور کشمیر کی گریٹر کشمیر کونسل کے سپرد کرنا ہے۔ یہ حل جنرل مشرف کے چار نکاتی فارمولہ سے ملتا جلتا ہے۔ مرکزی جماعت کانگریس دفعہ 370 کے تحت ہی کشمیر کو مربوط کرنے کے حق میں ہے۔ جبکہ بھارتی جنتا پارٹی ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ہندوستان میں ضم کرنے اور پاکستانی زیر انتظام کشمیر کو واپس لینے کے حق میں ہے۔ حریت کانفرنس جو کشمیر کی 32 جماعتوں اور گروہوں کا مجموعہ ہے وہ پوری ریاست کا حل سلامتی کونسل کی قراردادوں کے تحت حق خودارادیت میں تلاش کرتی ہے جس میں ''مکمل خودمختاری'' بھی شامل ہے۔ مجموعی طور ہر شخص اور پارٹی اپنے ذاتی، خاندانی اور اقتصادی مفادات میں کشمیر کا حل چاہتا ہے۔

گلگت بلتستان اور لداخ کے لوگوں کے آپشن نہایت سیدھے سادھے بالترتیب پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ مکمل انضمام ہے۔ جبکہ آزاد کشمیر کے 95 فیصد لوگ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ دیگر 5 فیصد پاکستان کے خلاف یا ہندوستان کے حق میں نہیں بلکہ پوری ریاست کو ایک آزاد اور

خودمختار ملک کے طور یکجا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ریاست کے دونوں حصوں میں مقامی جماعتیں اٹانومی اور سیلف رول الحاق ہندوستان یا پاکستان، ریاستی تشخص یا خودمختار کشمیر، الیکشن سٹنٹ کے طور پر استعمال کرتی ہیں پھر بھول جاتی ہیں اور مرکزی جماعتیں مرکز میں کشمیر کے مسئلے کو لوگوں کے جذبات بھڑکانے اور ایک دوسرے کو زچ کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

اگر تقسیم ہند کے اصولوں کے مطابق پوری ریاست کا الحاق 14 اگست 1947 کو ہی پاکستان سے کیا گیا ہوتا یا سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق 1949 کے جنگ بندی معاہدے کے ساتھ ہی فوجوں کے انخلا اور رائے شماری کا انعقاد ہو گیا ہوتا تو، وہ یقیناً آئیڈیل حل ہوتا۔ لیکن اب زمینی حقائق، عالمی معاملات کی وجہ سے بدل گئے ہیں۔ ہمیں عالمی طاقتوں کے اس خطے میں موجودگی اور ریاست کے دونوں حصوں میں لوگوں کے رجحان کا ادراک کرنا پڑے گا جو بالکل واضح ہے کہ جموں اور لداخ والے ہندوستان کی طرف اور آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان، پاکستان کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں، جبکہ وادی کشمیر اور اس کے مضافات یکسر ہندوستان کے خلاف ہیں، بھلے وہ پاکستان کے حق میں ہو یا خودمختاری۔

آئیڈیل حل کے لیے پاکستان کا سیاسی استحکام، اقتصادی ترقی، سفارتی مستعدی اور فعالیت ضروری ہے تاکہ یہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی سطح پر آ جائے اور مقبوضہ کشمیر میں بھی مزاحمت کی سطح برقرار رہنی چاہیے تاکہ کشمیر کی آبادی کا تناسب بگاڑ نہ دیا جائے گا۔ لیکن ہندوستان کی سفارتی مستعدی نے پاکستان کی بین الاقوامی ساکھ اتنی متاثر کر کے اس کو دفاعی پوزیشن میں لے آیا ہے کہ دنیا کشمیریوں کی بے پناہ قربانیوں، ظلم وستم کے باوجود ان کے وکیل، پاکستان کی بات سننے کو کوئی تیار نہیں جبکہ صرف یہی واحد ملک ہے جو کشمیر کی آزادی کی حمایت کرتا ہے۔ ہندوستان کی فوج، قتل وغارت اور آبادی کا تناسب بگاڑنے میں اس حد تک آگے جا چکی ہے کہ اس کا فوری تدارک کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ کشمیر صرف بنجر اور بے آب وگیاہ زمین رہ جائے گی، جنگل، باغات، دریا، جھیلیں، چٹیل میدان بنا دیئے جائیں گے، کشمیری بھی نہیں رہیں گے۔ اس صورتِ حال میں زمینی حقائق، جماعتوں اور علاقائی

341

صورتِ حال کے پیش نظر جو معقول حل مجھے نظر آتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

1۔ پہلے مرحلے میں جن خطوں اور لوگوں کی رائے واضح ہے (جن میں آزاد کشمیر، جموں، لداخ اور گلگت بلتستان ہیں) اور وہ اس ملک کے خلاف برسرپیکار نہیں اور نہ ان کے خلاف کوئی تحریک ہے جن کے کنٹرول میں ہیں، ان کو ان ملکوں میں باوقار طریقے سے اسی سیاسی یونٹ کے طور صوبے کے برابر یا ان کی مرضی کے مطابق کوئی سیاسی مقام دیا جائے،

2۔ وادی کشمیر اور اس سے متصل، وادی چناب، وادی پیر پنجال کے علاقوں کو ایک سیاسی جغرافیہ کے طور یونٹ تسلیم کر کے اس جغرافیائی یونٹ کو ایک مکمل خود مختار ملک کے طور تسلیم کیا جائے۔ کیوں کہ اپنی شناخت اور آزادی کی بحالی کی جنگ صرف ان ہی علاقوں میں لڑی جا رہی ہے۔ ہندوستان کو دنیا کو بالعموم اور برصغیر کو بالخصوص امن کا گہوارہ بنانے کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔

یا

3۔ پیرا نمبر 2 میں درج خطہ کو 1947 کی پوزیشن کی طرز پر اندرونی خودمختاری دے کر پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ معاہدہ جوں کا توں کی روح کے مطابق ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ یکساں تعلقات رکھنے کی اجازت دی جائے اور ان علاقوں کا دفاع ہندوستان اور پاکستان مشترکہ طور کریں، خارجہ امور تینوں حصوں کی حکومتیں اتفاق رائے سے طے کر کے اس پر اطلاق کا اختیار اس جغرافیائی یونٹ کو دیا جائے۔ اگر یہ سلسلہ کم از کم بیس سال تک کامیابی سے چلتا رہا تو اس کو مستقل کیا جائے۔

یہ صورتِ حال انڈورا جیسی ہو گی جو سپین اور فرانس کے مابین ہے۔ 468 کلومیٹر پر محیط یہ وادی 988 سے سپین اور فرانس کے درمیان مختلف انداز

میں متنازعہ چلی آ رہی تھی جس کا حل 1993 میں ہوا جس کے بعد فرانس کے صدر اور سپین کے رومن کیتھولک کے بشپ آف ارگل (Bishop of Urgell) اس وادی کے Co-Princes ہیں لیکن یہ 1993 سے ایک ملک کی حیثیت سے یو این کا ممبر اور یورپین یونین کا حصہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی کشمیر سے منسلک دیگر امور، پانی، سیاہ چین، بے گھر لوگوں کی آبادکاری، مستقبل میں کشمیر کے ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اور ان دونوں ملکوں کے درمیان تنازعات کے حل کے لیے بھی مستقل فورم بنانے کے لیے حتمی معاہدہ ہونا چاہیے۔ تاکہ ایک پرامن برصغیر وجود میں آئے، اور اس معاہدے کی توثیق سلامتی کونسل سے کرا کر سلامتی کونسل کی قراردادوں کے تحت حتمی (Final Setllement) سمجھا جائے۔

یونائیٹڈ نیشنز کمیشن کے 13/اگست 1948 کی قرارداد کی تحریری تشریحات جو اس کے مکتوب مجریہ 27/اگست 1948 کے پیرا (2) ضمیمہ ایک میں درج ہیں کے تحت Final Settlement کی تشریح یوں کی گئی ہے؛

"The expression "a final settlement of the situation" does not fall short of nor go beyond the terms of the Security Council resolution of 21st April 1948 and is in harmony with it. The Commission, however, is not Committed to a rejection of a peaceful solution which might be agreed upon by the two governments, provided that such solution reflects the will of the people."

وادی کشمیر کے لوگوں کی پاکستان کے ساتھ محبت، اور عقیدت مثالی اور قلبی ہے لیکن نوجوان

341

خودمختار کشمیر کے حامی ہیں جس کا مطلب پاکستان سے نفرت نہیں، بلکہ اپنی شناخت کے تحت زندہ رہنا ہے، جو صدیوں پرانی ہے۔ سبز ہلالی پاکستانی پرچم لہرانا جہاں اس بات کی غمازی ہے کہ وہ پاکستان سے محبت کرتے ہیں، وہیں بھارت سے نفرت کا اظہار اور بھارتی افواج کی چھیڑ بھی ہے۔ ہندوستان میں حکومت کے خلاف نفرت اور غصے کا اظہار کئی موقعوں پر اور کئی ریاستوں میں پاکستانی جھنڈے لہرا کر کیا جاتا ہے۔ وادی کشمیر کے لوگوں کی پاکستان سے ویسی ہی محبت ہے جیسی پاکستانیوں کی سعودی عرب سے لیکن اپنی شناخت کھو کر کوئی بھی سعودی عرب میں ضم ہونے کو تیار نہیں۔ یہی صورتِ حال وادیٔ کشمیر کے لوگوں کی ہے۔

ایسا کشمیر جس میں ہندوستانی فوج اور انتظامیہ نہ ہو، وہ پاکستان ہی ہوگا۔ کشمیری نوجوانوں کی اکثریت کے جذبات کے خلاف کوئی بھی مہم جوئی، مستقبل میں پاکستان کے خلاف بھی ایسے ہی حالات پیدا کر سکتی ہے، جس کا تجربہ ہم مشرقی پاکستان/ بنگلہ دیش میں کر چکے ہیں۔ اس لیے ان خطوط پر بھی سوچنا قومی مفاد کا تقاضا ہے۔ حریت کانفرنس کے آئین میں حق خودارادیت میں ''آزادی کا شامل ہونا'' جس کو پاکستان نے بھی تسلیم کیا ہے، اس کا احترام بھی پاکستان کی ذمہ داری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بالآخر پاکستانی اور کشمیری برسرپیکار ہو جائیں۔

میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میری تجاویز ہی اصل حل ہیں، لیکن آج تک کی پیش ہونے والی درجنوں تجاویز کا مرغوبہ ہیں جو وقتاً فوقتاً دی گئی ہیں جن کی روح، تقسیم ہند کی آزادی کے قانون 1947، سلامتی کونسل کی قراردادوں بالخصوص

- ☆ Dixon plan
- ☆ مہاراجہ کشمیر کے الحاق نامے، Stand Still
- ☆ Trifurection of State by BJP
- ☆ Self Rule by PDP
- ☆ Autonomy by NC

☆ مشرف کا چار نکاتی فارمولا،

☆ فاروق کاٹھواڑی کے Kashmir A way forward،

☆ سجاد غنی لون کے Achievable Nationalhood،

☆ ہندوستانی آئین کی دفعہ 370

☆ پاکستانی آئین کی دفعہ 257 میں پائی جاتی ہے۔

زمینی حقائق اور اس ریاست میں بسنے والے لوگوں کی اکثریت کی جذباتی کیفیت بھی یہی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے دعوے داروں، کشمیر کے مختلف حصے کے لوگوں کے عملی رجحان، مفادات اور زمینی حقائق اس حل کے متقاضی ہیں، پوری ریاست کے آزاد اور خود مختار ملک کا نظریہ جاذبِ نظر اور آئیڈیل تو ضرور ہے، لیکن اس کے لیے پہلے ریاست کی مسلمہ اور منفرد اکائیوں جموں، لداخ، وادی گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کا ایک دوسرے کو تسلیم کرانے کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کو منانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ تب تک وادی کشمیر میں انسانی بستی نابود ہو جائے گی۔

ایک سو سال کے ڈوگرہ جبر کی حکومت ریاست کے مختلف خطوں کو ہم آہنگ نہیں کر سکی نہ ہم خیال، اب ستر سال کی تقسیم کے بعد ان کا اکٹھا کیا جانا صرف نعرۂ مستانہ ہے اور کچھ نہیں۔ اب یہ خلیج اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ اس کا پاٹنا ممکن ہی نہیں۔ ہندوستان 70 سال میں وادی کشمیر اور اس کے ملحقہ علاقوں کے لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں کر سکا حالاں کہ اس نے ہر کوئی حربہ استعمال کیا اور پاکستان بھی کئی بار مہم جوئی کے باوجود کشمیر کو حاصل نہیں کر سکا۔

فرض کریں، سلامتی کونسل کی قرار دادوں کے مطابق رائے شماری کی صورت میں اگر ریاست کے لوگ دو ملکوں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دیں تو کیا دوسرا اپنے زیر کنٹرول علاقے کو چھوڑے گا؟ کیا ہندوستان نے ''رن آف کچھ'' کو ایوارڈ کے باوجود چھوڑ دیا؟ کیا منگلا ڈیم، نیلم، جہلم، کوہالہ پراجیکٹ، CPEC کو ریورس کیا جا سکتا ہے؟ یا ہندوستان نہرو ٹنل کے اس پار یا لداخ پر

مفاہمت کر سکتا ہے؟ وادی کشمیر میں ہندوستان کشمیر کی زمین پر زبردستی قبضہ[341] کر کے اس وقت تک کچھ حاصل نہیں کر سکا، اس لیے عقل مندی کا تقاضا، ہندوستان، پاکستان اور کشمیر کا مفاد اس میں ہے کہ جن علاقوں میں آزادی کی تحریک چل رہی ہے اس کی آزادی کا حق تسلیم کریں۔ ہزار سال کے بعد بھی ایسا ہی ہو گا آج ہی تسلیم کیا جائے تو دنیا بھر کے مفاد میں ہو گا۔

مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ آزاد کشمیر کے کچھ لوگ تقسیم کشمیر کی بات کرنا یا سننا گناہ اور جرم سمجھتے ہیں، لیکن تقسیم ہند کے قانون کے تحت اگر تحصیل، ضلع اور گاؤں، گھوٹ تقسیم ہو سکتے ہیں تو واضح جغرافیائی، لسانی اور مذہبی تقسیم والی اور اس کا رجحان رکھنے والی ریاست کیوں نہیں؟ میں اس کی وحدت کا مخالف نہیں، لیکن اس کے ممکن ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھ سے وادی کشمیر کے عام لوگوں کی نسل کشی دیکھی نہیں جاتی۔ ان کی قربانیوں، لاشوں اور ان کی ماں بہنوں کی عصمت دری کی دُہائی دے کر باقی لوگ اپنا سیاسی روزگار چلا رہے ہیں۔ یہ نہ تو اسلام ہے، نہ انسانیت۔

مفاد پرست عناصر ہمیشہ نئے نظریہ کو حماقت، پھر اس کی مخالفت اور بالآخر اس کو ایسے تسلیم کرتے ہیں جیسے کہ ان کے باپ دادا نے یہ نظریہ پیش کیا ہوا گر یہ معاملہ کبھی ہو گیا (جو یقینا ہو گا جس کی صورت ممکن ہے قدرے مختلف ہو) تو ہر کس و ناکس دعویٰ کرے گا کہ اس نے یا اس کے باپ دادا نے یہ تجویز 1947 میں پیش کی تھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کشمیر کے مسئلے نے ہندوستان اور پاکستان میں ہی نہیں دنیا بھر میں ایک کاروباری حیثیت اختیار کر لی ہے جس میں کشمیر کے سیاست دان بالخصوص اور دو ملکوں کی اسٹیبلشمنٹ اور سیاست دان برابر کے شامل ہیں۔ کچھ مفاد پرستوں نے دونوں ملکوں اور دنیا بھر میں NGO's بنا کر دکانیں کھولی ہیں، جہادی اور عسکری تنظیمیں بنائی ہیں۔ یہ سب لوگ کسی فائیو سٹار ہوٹل میں راؤنڈ ٹیبل یا کوئی بڑی کانفرنس یا کوئی جلسہ جلوسوں اور ریلی نکال کر اپنے مربیوں سے رقم وصول کر کے کشمیر کے لیے اپنی خدمات کو رجسٹرڈ کراتے ہیں۔ یہ لوگ اس مسئلہ کے حل میں مخل ہو نگے کیوں کہ ان کا مفاد اس کے قائم رہنے میں ہے۔ لیکن برصغیر اور دنیا کا مفاد اس کے حل ہونے میں ہے۔ کشمیر کی

آزادی کے لیے پاکستانی جماعتیں (بشمول آزاد کشمیر) کی تمام تر ہمدردیوں کے باوجود، اپنی ذیلی INGOاور کچھ نے عسکری تنظیمیں بنا کر کشمیر یا انسانی حقوق کا سابقہ یا لاحقہ لگا کر سرگرمیاں کرتی ہیں، دنیا سے مدد لیتی ہیں اور ان تنظیموں میں اپنے عزیز و اقارب کو نوکریاں دے کر قوم پر احسان چڑھاتی ہیں کہ انہوں نے اپنے خاندان کو کشمیر کے لیے وقف کر دیا ہے۔ وادی میں ہونے والے ہر قتل و غارت اور آبروریزی پر اس وقت تک جلسے جلوس اور سیمنارز کرتے ہیں جب تک اس جیسا دوسرا واقع نہیں ہوتا۔ یہ کوئی انکشاف نہیں۔ کشمیر، ہندوستان یا پاکستان اور اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والی دنیا یہ حقیقت جانتی ہے۔ چند لوگوں کے اقتصادی اور سیاسی مفاد کی خاطر کشمیر اور برصغیر کو ان کا یرغمال نہیں بنایا جا سکتا۔

یہاں پر مشہور وکی لیکس انکشافات کے مطابق دہلی میں امریکی سفیر David Mulfod نے 2006 میں اپنے ملک کو جو مراسلہ لکھا ہے، اس کا حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں:

"Kashmir politics is as filthy as Dal Lake. Corruption cuts across party line and most Kashmiries take it as an article of faith politically connected Kashmiries take money from both India and Pakistan. Money from Pakistan and Indian intelligence agencies and from Saudi and other foreign extremists have further distorted Kashmiri Politics, incentirzed leaders to perpetuate the conflict, and perverted state and central institutions".

(Foreign Policy Journal)